الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

مسائل کو مستقبل کے خانہ میں ڈالنا اور
مواقع کو استعمال کرنا
یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز ہے

اگست ۱۹۸۹
شمارہ ۱۵۳

تذکیر القرآن

جلد اول : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ

جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۵۳ اگست ۱۹۸۹

فہرست

مشرک کا حکم	صفحہ ۲	مردہ سے زندہ	صفحہ ۱۵
شاہ کلید	۳	اسلوب عصر	۱۷
نازک مسئلہ	۴	فخر نہیں	۱۸
قیامت میں ادائگی	۷	کہاں سے کہاں	۲۰
اجنبی دین	۸	سفر نامہ امریکہ	۲۱
بے فائدہ معرکہ آرائی	۹	ـــــ تیسری قسط	
ابو طالب	۱۰	تیوہار اور قومی یک جہتی	۴۱
بے خبری	۱۱	خبر نامہ اسلامی مرکز	۴۵
وضو کی برکت	۱۳	ایجنسی الرسالہ	۴۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳، فون: 697333, 611128

مشرک کا حکم

قرآن میں ہے کہ خنزیر کا گوشت ناپاک ہے (او لحم خنزیر فانہ رجس) اسی طرح قرآن میں ہے کہ مشرک ناپاک ہیں (انما المشرکون نجس) اس لفظی اشتراک کی بنا پر کچھ لوگوں نے سمجھ لیا کہ جس طرح خنزیر باعتبار جسم ناپاک ہے، اسی طرح مشرک بھی باعتبار جسم ناپاک ہے۔ چنانچہ مشرک کا برتن، کھانا، کپڑا اور اس کی تمام چھوئی ہوئی چیزوں کو ناپاک سمجھ لیا گیا۔ حتی کہ کہا گیا کہ کوئی مسلمان اگر مشرک سے مصافحہ کرلے تو اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ کو دھوئے اور وضو کرکے اپنے کو پاک کرے (قال اشعث عن الحسن من صافحهم فليتوضأ، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۳۴۶)

یہ صحیح نہیں۔ اگرچہ مذکورہ دونوں آیتوں میں بظاہر یکساں لفظ ہے، مگر دونوں کا مطلب یکساں نہیں۔ "خنزیر نجس ہے" کا مطلب یہ ہے کہ خنزیر کا جسم نجس ہے۔ اس کے برعکس "مشرک نجس ہے" کا مطلب یہ ہے کہ مشرک کا عقیدہ نجس ہے۔ جہاں تک مشرک کے بدن کی نجاست کا تعلق ہے، جمہور کی رائے یہ ہے کہ مشرک کا بدن اور اس کا وجود نجس نہیں۔ اسی بنا پر اہل کتاب کے کھانے کو جائز ٹھہرایا گیا ہے (واما نجاسة بدنه فالجمهور على انه ليس بنجس البدن والذات لان الله تعالى احل طعام اهل الكتاب، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۳۴۶) عبدالرحمٰن الجزیری لکھتے ہیں:

اما قوله تعالى (انما المشركون نجس) فالمراد به النجاسة المعنوية التي حكم بها الشارع وليس المراد ان ذات المشرك نجسة كنجاسة الخنزير (الفقه على المذاهب الاربعه، الجزء الاول، صفحہ ۶)

اللہ تعالیٰ کا قول کہ مشرکین نجس ہیں، اس سے مراد معنوی نجاست ہے جس کا حکم شارع نے بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرک کا وجود ناپاک ہے جس طرح خنزیر کا وجود ناپاک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام مسائل مسلمانوں میں دعوتی ذہن ختم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ دوسری قوموں کو مدعو سمجھنا انھیں قابل التفات بناتا ہے۔ مگر جب دوسری قومیں مدعو نہ سمجھی جائیں تو وہ قابل اجتناب بن کر رہ جائیں گی۔

شاہ کلید

مانٹگومری واٹ (W. Montgomery Watt) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: اسلام کی عظمتِ رفتہ (The Majesty that was Islam) یہ کتاب اگرچہ اسلام کی تعریف پر ہے۔ مگر اس کا نام بہت زیادہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ کتاب کے اس نام کو دیکھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ تصور قائم ہوتا ہے کہ اسلام اپنی ساری عظمتوں کے باوجود ماضی کی چیز تھا، وہ مستقبل کی چیز نہیں۔ کتاب کا یہ نام ماضی کے بارہ میں فخر اور مستقبل کے بارہ میں مایوسی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

مصنف نے کتاب کے پانچویں باب میں فلکیات کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ فلکیات کا فن عربوں کے لیے ایک عملی سائنس تھی۔ کیوں کہ ان کے لیے اپنے مذہب کی رو سے یہ ضروری تھا کہ وہ ہر اسلامی شہر سے مکہ کے رخ کو جانیں۔ تاکہ نمازوں کے وقت اپنے چہرہ کا رخ اس کی طرف کر سکیں:

Astronomy was a practical science for the Arabs... because they had to know the direction of Mecca from every Islamic city, in order to face in this direction in their prayers (p. 228).

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے عبادتی اعمال غیر متعلق رسوم نہیں ہیں، بلکہ ان کا رشتہ دوسرے انسانی علوم سے براہِ راست طور پر جڑا ہوا ہے ـــــ نماز کا تعلق سمتوں کے علم سے ہے۔ اسی طرح روزہ کا تعلق کیلنڈر سے۔ زکوٰۃ کا تعلق علم الحساب سے۔ حج کا تعلق علم جغرافیہ سے، وغیرہ۔

مسلمانوں کے درمیان اسلام اگر حقیقی شکل میں زندہ ہو تو اسی کے ساتھ دوسری تمام چیزیں بھی ان کے درمیان زندہ ہو جائیں گی۔ اسلام کا قیام اپنے آپ دوسری چیزوں کے قیام کا ذریعہ بن جائے گا۔ اسلامی تاریخ کے دورِ اول میں ایسا ہی پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان اسلام اپنی حقیقی صورت میں زندہ نہیں۔ اس لیے دوسری چیزیں بھی ان کے درمیان زندہ نظر نہیں آتیں ـــــ اسلام شاہ کلید (Master key) ہے، دینی امور کے لیے بھی، اور اسی کے ساتھ ہر قسم کے دنیوی امور کے لیے بھی۔

نازک مسئلہ

خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان پر کچھ شورش پسند مسلمانوں نے قاتلانہ حملہ کیا اور ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو انھیں شہید کر ڈالا۔ اس وقت آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ آپ کی مدت خلافت ۱۲ سال ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ اس وقت حج کی ادائگی کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ مقام سرف تک پہونچی تھیں کہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر ملی۔ اس کے بعد وہ راستہ ہی سے مکہ کی طرف واپس روانہ ہوگئیں۔ مکہ پہونچیں تو ان کی آمد کی خبر سن کر لوگ آپ کی سواری کے گرد جمع ہو گیے۔ حضرت عائشہ نے مجمع کے سامنے ایک تقریر کی جس میں کہا کہ خدا کی قسم، عثمان مظلوم مارے گیے۔ خدا کی قسم، میں ان کے خون کا بدلہ لوں گی (قتل واللہ عثمان مظلوما واللہ لاطلبن بدمہ، العبقریات الاسلامیہ، صفحہ ۲۱۷)

حضرت عائشہ اونٹ پر سوار ہو کر مکہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئیں۔ مکہ اور اطراف مکہ میں منادی کر دی گئی کہ ام المومنین عائشہ بصرہ جا رہی ہیں۔ جو شخص اسلام کا حامی ہو اور خون عثمان کا بدلہ لینا چاہے، وہ قافلہ میں شریک ہو جائے۔

مکہ سے ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا لشکر روانہ ہوا۔ باہر نکلے تو اطراف وجوانب سے لوگ جوق در جوق آکر قافلہ میں شریک ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جلد ہی اس لشکر کی تعداد تین ہزار ہو گئی۔

یہ لوگ چلتے ہوئے ایک مقام پر پہونچے جہاں ایک چشمہ تھا۔ حضرت عائشہ کے اونٹ کو دیکھ کر وہاں کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہ نے یہ منظر دیکھ کر چشمہ کا نام پوچھا۔ بتایا گیا کہ یہ مواُب کا چشمہ ہے۔ یہ نام سنتے ہی حضرت عائشہ نے کہا کہ مجھ کو لوٹاؤ۔

لوگوں نے سبب دریافت کیا تو حضرت عائشہ نے کہا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی بیویاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی وہاں موجود تھی۔ آپ نے اپنی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کاش مجھ کو معلوم ہوتا کہ تم میں سے کس کو دیکھ کر مواُب کے کتے بھونکیں گے یہ کہہ کر حضرت عائشہ نے اونٹ کی گردن پر ہاتھ مارا۔ اونٹ وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ ایک دن اور ایک رات وہیں مقیم رہیں۔ تمام لشکر بھی آپ کے ساتھ وہیں ٹھہرا رہا۔

اس کے بعد کچھ لوگوں نے منصوبہ بناکر اچانک شور کردیا کہ جلدی کرو، جلدی کرو۔ علی تم تک پہنچ گیے۔ یہ سن کر تمام لشکر نہایت عجلت کے ساتھ بصرہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت عائشہ کے اونٹ کو بھی تیزی سے اٹھاکر بھیڑ کے ساتھ روانہ کردیا۔ حضرت عائشہ کے سوال پر انھیں بتایا گیا کہ کسی نے غلطی سے آپ کو اس چشمہ کا نام مواُب بتادیا تھا۔ درحقیقت یہ چشمہ وہ چشمہ نہیں ہے۔ اور نہ مواُب کا چشمہ اس راستہ میں آتا ہے۔

یہ لوگ چلتے رہے، یہاں تک کہ وہ بصرہ کے قریب پہونچ گیے جہاں خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب مقیم تھے۔ یہیں وہ جنگ پیش آئی جو اسلامی تاریخ میں جنگ جمل (۳۶ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں خود مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے۔ ایک گروہ کے قائد حضرت علی تھے جن کے ہاتھ پر حضرت عثمان کے بعد خلافت کی بیعت ہوئی تھی۔ دوسری طرف حضرت عائشہ تھیں جو خون عثمان کا بدلہ لینے کے نام پر وہاں پہنچی تھیں، کیوں کہ انھیں یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ حضرت علی خون عثمان کے معاملہ کو دبا رہے ہیں اور قاتلینِ عثمان سے انتقام لینے پر تیار نہیں ہیں۔ حضرت عائشہ اس وقت ایک اونٹ پر سوار تھیں، اس لیے اس جنگ کا نام جنگ جمل پڑ گیا۔

جنگ جمل کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ بوقت مقابلہ حضرت عائشہ کی طرف سے لڑنے والوں کی تعداد تقریباً ۳۰ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ دوسری طرف حضرت علی کی فوج کی تعداد تقریباً ۲۰ ہزار تھی۔ حضرت عائشہ کے لشکر میں سے ۹ ہزار آدمی میدان جنگ میں مارے گیے۔ اور حضرت علی کی فوج میں سے ایک ہزار ستّر آدمی کام آئے۔ گویا مجموعی طور پر تقریباً دس ہزار مسلمان خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہلاک ہوگیے۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ عوامی تحریک اٹھانا جتنا آسان ہے، اس کو کنٹرول کرنا اتنا آسان نہیں۔ خواہ اس کی قیادت ام المومنین جیسی مقدس ہستی کیوں نہ کر رہی ہو۔ جو لوگ جذباتی اشو پر پرجوش تقریریں کرکے بڑی بڑی تحریکیں اٹھاتے ہیں اور عوام کی بھیڑ اکٹھا کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ ہمیشہ آغاز سے زیادہ انجام پر غور کریں۔

اس قسم کی عوامی تحریکوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں لیڈر نمبر ۱ پر ہوتا ہے

اور عوام نمبر ۲ پر۔ مگر جب جوش و جذبہ میں بھرے ہوئے عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو چلی ہو تو اس کے بعد صورت حال یکسر بدل جاتی ہے۔ اب عوام کو نمبر ۱ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور لیڈر نمبر ۲ کے مقام پر چلا جاتا ہے۔ اب تحریک کی رہنمائی کے لیے عملی طور پر صرف عوام کا جوش رہ جاتا ہے نہ کہ رہنماؤں کا ہوش۔

ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ اس قسم کے عوامی کام کو بہت زیادہ سوچ سمجھ کر شروع کیا جائے۔ کیوں کہ اس قسم کے کام کو شروع کرنا ہمیشہ انتہائی آسان ہوتا ہے، مگر اس کو نیک انجام تک پہونچانا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ حضرت عائشہ اگر حج کے بعد گھر (مدینہ) واپس جانے کا فیصلہ کرتیں تو یہ ان کے لیے بالکل سادہ اور آسان سی بات ہوتی۔ مگر مواُب کے چشمہ پر جب کہ وہ بھیڑ کے درمیان تھیں تو یہی سادہ سی بات ان کے لیے ناممکن کے درجہ میں مشکل ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہنگامی مواقع پر بیچ سے رائے بدلنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے کاموں میں بیچ سے رائے بدلنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دریا کو چھلانگ کے ذریعہ پار کرنا چاہے، اور جب وہ اس کے درمیان میں پہونچے تو یہ فیصلہ کرے کہ مزید تیاری کے لیے اس کو پیچھے کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔

اقوالِ حکمت

جیبی سائز

الرسالہ کے پہلے صفحہ پر ہر ماہ جو مختصر اقوال چھپتے رہے ہیں، وہ اور کچھ دوسرے حکیمانہ اقوال ملا کر یہ کتاب تیار کی گئی ہے۔ جو جیبی سائز کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

ہر صفحہ پر ایک قول جلی خط میں درج کیا گیا ہے۔

یہ کتاب گویا زندگی کی سائنس ہے۔ اس میں کامیابی اور ترقی کے گُر بتائے گیے ہیں۔ وہ نہ صرف آپ کے لیے ایک رہنما کتاب ہے، بلکہ وہ آپ کی طرف سے آپ کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ دکاندار حضرات اپنے گاہکوں کو یہ کتاب بطور گفٹ دے کر اپنی تجارت کو فروغ دے سکتے ہیں۔

قیامت میں ادائگی

عن ابی هریرة ، ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال : اتدرون ما المفلس ؟ قالوا: المفلس فینا من لا درهم له ولا متاع . فقال : ان المفلس من امتی من یاتی یوم القیامة بصلاةٍ وصیام وزکاة ویاتی قد شتم هذا ، وقذف هذا ، واکل مال هذا ، وسفك دم هذا ، و ضرب هذا ، فیعطی هذا من حسناته ، وهذا من حسناته ، فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایاهم فطرحت علیه ، ثم طرح فی النار (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم میں مفلس وہ شخص ہے جس کے پاس نہ درہم ہو اور نہ کوئی سامان۔ آپ نے فرمایا کہ میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز اور روزہ اور زکواۃ لے کر آئے۔ اسی کے ساتھ وہ اس حال میں آئے کہ اس نے کسی کو گالی دی ہو، کسی کو الزام لگایا ہو، کسی کا مال کھایا ہو، کسی کا خون بہایا ہو، کسی کو مارا ہو۔ پس اس کی نیکیاں اس کو اور اس کو دے دی جائیں۔ پھر اگر حساب برابر ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں تو لوگوں کے گناہوں کو لے کر اس کے اوپر ڈال دیا جائے۔ اور پھر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے۔

یہ حدیث پڑھ کر ان لوگوں کے اوپر کپکپی طاری ہونی چاہیے جو دوسروں کا حق مارتے ہیں۔ کیوں کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ دوسروں کے مال پر مال دار بننے والے قیامت میں بالکل مفلس ہو جائیں گے۔ جو لوگ دوسروں کے گھر پر قبضہ کر کے گھر والے بنے ہوئے ہوں، وہ آخرت میں اس طرح بے گھر ہو جائیں گے کہ درخت کے پتوں کا سایہ بھی نہ ہوگا جس کے نیچے وہ پناہ لے سکیں۔

دوسری طرف اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے خوش خبری ہے جن کا حق مارا گیا ہے۔ اس دنیا میں جو چیز انھیں گالی، الزام تراشی، غصب، تشدد اور جارحیت کے روپ میں مل رہی ہے۔ قیامت کے دن اس کی ادائگی ایسے قیمتی سکوں کی صورت میں ہوگی جس سے آخرت کی دنیا کی ہر چیز حاصل کی جا سکتی ہے۔ دنیا کے مفلس، اس دن آخرت کے دولت مند کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

اجنبی دین

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام شروع ہوا تو وہ اجنبی تھا۔ دوبارہ وہ ویسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ وہ تھا۔ تو مبارکی ہو اجنبیوں کے لیے (بدأ الاسلام غریباً وسیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء، رواہ مسلم) ابتدائی زمانہ میں اسلام کس طرح اجنبی تھا، اس کی مثالیں قرآن و حدیث سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ کے مشرکین کے سامنے یہ دعوت پیش کی کہ ایک اللہ کو اپنا الٰہ بناؤ اور دوسرے الٰہوں کو چھوڑ دو تو انھوں نے کہا کہ کیا اس پیغمبر نے کئی الٰہ کی جگہ ایک الٰہ کر دیا۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے (ص ۵) مکہ کے مشرکین اللہ کو مانتے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے بزرگوں کو بھی اونچا درجہ دے رکھا تھا۔ ان کے بت بنا کر وہ ان کو پوجتے تھے۔ پیغمبر اسلام نے جب ایک اللہ کے سوا ہر ایک کی بڑائی کا انکار کیا تو یہ بات انھیں اجنبی اور نامانوس معلوم ہونے لگی۔

اسی طرح ایک مثال یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں عرب کے لوگ میراث میں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں سمجھتے تھے۔ جب قرآن میں یہ حکم آیا کہ ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے (للذکر مثل حظ الانثیین) تو انھیں اپنے ذہن کے اعتبار سے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، کیا عورت اپنے باپ کے ترکہ میں آدھی کی حقدار ہے، حالاں کہ وہ نہ گھوڑے کی سواری کرتی ہے اور نہ دشمن سے لڑ سکتی ہے (یارسول اللہ تعطی الجاریۃ نصف ما ترک ابوھا ولیست ترکب الفرس ولا تقاتل القوم، تفسیر ابن کثیر، الجزء الاول، صفحہ ۴۵۸)

حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، دین آج دوبارہ اسی اجنبی حالت کو پہنچ چکا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ موجودہ مسلمانوں میں آج خالص توحید اجنبی چیز بن چکی ہے۔ وہ صرف اس توحید کو جانتے ہیں جس میں اللہ کی عظمت کے ساتھ ان کے اپنے بڑوں کو بھی شریک عظمت کیا گیا ہو۔ وہ صرف اس دین سے مانوس ہیں جس میں ان کے بزرگوں کو بھی اسی طرح تنقید سے بالاتر رکھا گیا ہو جس طرح پیغمبر خدا تنقید سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح شریعت کے نام سے وہ صرف اپنی خواہشوں کی شریعت کو جانتے ہیں۔ وہ شریعت جو ان کی خواہشوں پر روک لگائے۔ مثلاً سنت کے طریقہ پر طلاق دینا، عورتوں کو پورا حصہ ادا کرنا، تو ایسی شریعت ان کی نظر میں بالکل اجنبی ہے۔

بے فائدہ معرکہ آرائی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم آغازِ نبوت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں رہے۔ وہاں مقدس کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ روزانہ عبادت کے لیے کعبہ میں جاتے تھے۔ مگر آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ تنہا یا اپنے ساتھیوں کو لے کر بتوں کو نکالیں اور ان کو توڑ کر پھینک دیں۔ آپ وقتی طور پر ایسا کر سکتے تھے۔ لیکن اگر آپ ایسا کرتے تو یقینی تھا کہ مکہ کے مشرکوں سے بے نتیجہ ٹکراؤ ہوتا۔ مزید یہ کہ وہ لوگ اگلے ہی دن دوسرے بتوں کو لاکر وہاں رکھ دیتے اور مسلمان انھیں روک نہ پاتے۔ مگر ہجرت کے بعد جب مکہ فتح ہو گیا اور مکہ میں آپ کا اقتدار قائم ہو گیا تو آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام بتوں کو وہاں سے نکال کر پھینک دیا اور کعبہ کو مقدس عبادت گاہ کی حیثیت سے دوبارہ قائم کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام کا طریقہ نتیجہ رخی (Result-oriented) طریقہ ہے۔ آپ کا طریقہ یہ ہے کہ صرف اس وقت اقدام کیا جائے جب کہ اقدام کو نتیجہ خیز بنانے کا امکان پیدا ہو چکا ہو۔ ایسا اقدام ہرگز نہ کیا جائے جو صرف بے فائدہ ہنگامہ آرائی کر کے ختم ہو جانے والا ہو۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سیرتِ رسول کے اس پہلو سے کوئی سبق نہیں لیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تمام کارروائیاں اس طریق رسول کے سراسر خلاف ہیں۔ ۱۸۳۱ میں پنجاب کے رنجیت سنگھ کے خلاف اٹھنے والے شہیدوں سے لے کر ۱۹۸۸ میں اجودھیا کی بابری مسجد کے لیے دھوم مچانے والے غازیوں تک سب جو کچھ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس کو ایک لفظ میں، بے فائدہ معرکہ آرائی کہا جا سکتا ہے۔ اس مدت میں مسلمانوں کے تمام اقدامات یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی بربادی پر ختم ہوئے۔ وہ ان کو کوئی مثبت فائدہ نہ دے سکے۔

اس قسم کے ہنگامے یقینی طور پر پیغمبر کی سنت کے مطابق نہیں۔ وہ جھوٹی ہنگامہ بازی اور بے معنی معرکہ آرائی کے خانہ میں جانے والی کارروائیاں ہیں نہ کہ سنتِ رسول کی سچی پیروی کے خانہ میں لکھا جانے والا عمل۔

ابو طالب

مکہ میں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیغمبر ہونے کا اعلان کیا تو مردوں میں سب سے پہلے جو شخص ایمان لایا وہ حضرت علی بن ابی طالب تھے۔ جن کی عمر اس وقت تقریباً ۱۰ سال تھی۔ اس وقت مکہ کے حالات اتنے سخت تھے کہ نماز بھی آپ کو چھپ کر پڑھنی پڑتی تھی۔ چنانچہ آپ حضرت علی کے ساتھ مکہ کے باہر پہاڑوں کی طرف چلے جاتے اور وہاں لوگوں کی نظروں سے دور ہو کر نماز ادا کرتے۔ ایک روز مکہ کی گھاٹی میں آپ حضرت علی کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے کہ اتفاقاً ابو طالب وہاں آ گیے۔ نماز کا طریقہ انھیں بالکل اجنبی معلوم ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اے میرے بھتیجے، یہ کون سا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب کو بتایا کہ اللہ نے مجھے اپنا پیغمبر بنایا ہے اور مجھے عبادت کا وہ طریقہ بتایا ہے جو اس کو پسند ہے۔ آپ بھی اس دین کو قبول کر لیں۔ ابو طالب نے جواب دیا کہ اے میرے بھتیجے، میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے باپ دادا کے دین کو اور جس پر وہ تھے اسے چھوڑ دوں (انی لا استطیع ان افارق دین اٰبائی وما کانوا علیہ)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت علی کو انھوں نے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو ان سے اس کی بابت دریافت کیا کہ یہ کون سا دین ہے جس پر میں تم کو دیکھ رہا ہوں۔ حضرت علی نے کہا کہ اے میرے باپ، میں اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوں اور جو کچھ وہ لائے ہیں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ ان کے ساتھ میں نے نماز پڑھی ہے اور ان کی پیروی کی ہے۔ اس کے جواب میں ابو طالب نے اپنے بیٹے سے کہا: انھوں نے تم کو بھلائی کے سوا کسی اور چیز کی دعوت نہیں دی ہے۔ تم اس پر جمے رہو (انہ لم یدعك الا الی خیر فالزمہ) سیرۃ ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۶۵

اپنے آبائی بزرگوں کو ماننے کے لیے ابو طالب کو کوئی نیا فیصلہ نہیں کرنا تھا۔ مگر اپنے معاصر پیغمبر کو ماننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ سچائی کو از سر نو دریافت کریں۔ اور بلاشبہ اس دنیا میں پہلا کام سب سے زیادہ آسان کام ہے اور دوسرا کام سب سے زیادہ مشکل کام۔ "ابو طالب" ایک اعتبار سے ایک شخص کا نام ہے، اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک کردار کا نام ہے۔ یہ کردار، کسی نہ کسی شکل میں، ہر زمانہ میں موجود رہتا ہے۔

بے خبری

نومبر ۱۹۸۸ میں جزیرہ مالدیپ میں ایک واقعہ ہوا۔ مالدیپ کا ایک تاجر جس کا نام عبداللہ لطفی ہے، اس نے پڑوسی ملک سری لنکا میں اپنا خفیہ دفتر قائم کیا۔ وہاں اس نے دہشت پسند نوجوانوں کا ایک دستہ تیار کیا اور ان کو ہتھیار دے کر کشتیوں کے ذریعہ مالدیپ (Male) کے ساحل پر ۳ نومبر ۱۹۸۸ کو اتار دیا۔ اس کا مقصد مالدیپ میں "فوجی انقلاب" لانا تھا۔ چنانچہ اس نے فوراً مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم کی رہائش گاہ کو گھیر لیا۔ اور اس کی دیواروں کو گولی کا نشانہ بنانا شروع کیا۔

مالدیپ بحر ہند کا ایک بہت ہی چھوٹا ملک ہے۔ اس کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں ہے۔ عبداللہ لطفی کا خیال تھا کہ وہ غیر مسلح مالدیپ کو نہایت آسانی سے فتح کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر سکتا ہے۔ مگر اس کو مکمل ناکامی ہوئی۔ اس کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مالدیپ کی جیل میں ہے۔

مالدیپ کے حالات بظاہر لطفی کے موافق تھے۔ اس کے باوجود اس کو اپنے مقصد میں ناکامی کیوں ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ لطفی معاملہ کے ایک پہلو کو جانتا تھا، مگر وہ اس کے دوسرے پہلو سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کو یہ معلوم تھا کہ مالدیپ کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں ہے۔ مگر وہ اس دوسری حقیقت سے بے خبر رہا کہ جدید مواصلات کے اس دور میں مالدیپ نہایت آسانی سے باہر کے ملک سے فوج منگا سکتا ہے جو اس کا بچاؤ کر سکے۔

مالدیپ کا ٹیلیفونی نظام نہایت عمدہ ہے۔ وہ سٹلائٹ کے ذریعہ کسی بھی ملک سے فوری طور پر ربط قائم کر سکتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی لطفی نے مالدیپ کے صدارتی محل پر حملہ کیا، مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم نے ہندستان کی حکومت سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے نئی دہلی کو صورتحال سے باخبر کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ وہ فوراً ان کی مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیج دیں۔

ہندستان کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس حادثہ نے ہندستان کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ بحر ہند میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکے۔ وہ مالدیپ کے معاملہ میں مداخلت کر کے اس علاقہ میں اپنے آپ کو فوجی نجات دہندہ کی حیثیت سے پیش کر سکے۔ چنانچہ صدر مالدیپ کی درخواست ملنے

کے بعد چھ گھنٹہ کے اندر ہندستانی فوج مالدیپ (Male) کے ہوائی اڈہ پر اتر گئی۔ اس نے چند گھنٹوں کے آپریشن میں لطفی اور اس کے ساتھیوں کو عین اس وقت گرفتار کر لیا جب کہ وہ اپنی سمندری کشتیوں کے ذریعہ سری لنکا کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مامون عبدالقیوم کی حکومت بحال ہوگئی۔

دہلی کے انگریزی ہفت روزہ انڈیا ٹوڈے (۳۰ نومبر ۱۹۸۸) نے اس معاملہ کی تفصیلی رپورٹ دی ہے۔ اس نے بجا طور پر لکھا ہے کہ مالدیپ پر حملہ کرنے والے اپنے حملہ میں کامیاب ہو سکتے تھے، اگر انھوں نے احتیاطی تدبیر پر عمل کیا ہوتا۔ اور ٹیلی فون اکسچینج اور ہوائی اڈہ پر قبضہ کر کے ان کو ناقابل استعمال بنا دیتے :

The attackers could have made it if they had taken care to neutralize the telephone exchange and the airport (45).

عبداللہ لطفی کو شاید قدیم صدارتی محل کا علم تھا۔ جس کی حیثیت صرف مقامی قلعہ کی ہوتی تھی۔ اس کو جدید صدارتی محل کا علم نہ تھا جو مواصلات کے سائنسی وسائل کے ذریعہ پورے عالم سے مربوط ہوتا ہے۔ قدیم شاہی محل کے لیے سمندر اور پہاڑ حائل ہو جاتے تھے۔ مگر جدید شاہی محل کی راہ میں کوئی سمندر یا کوئی پہاڑ حائل نہیں۔ وہ خلائی مواصلات کے ذریعہ پیغام رسانی کر سکتا ہے، اور فضائی سواریوں کے ذریعہ اپنے لیے مدد بلا سکتا ہے۔

مالدیپ کا یہ واقعہ علامتی طور پر جدید مسلم تاریخ کی تصویر ہے۔ وہ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کے ناکام اقدامات کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے بے شمار اقدامات کیے مگر ان کے تمام اقدامات بلا استثنار ناکام رہے۔ اس کی وجہ دوبارہ وہی تھی جو عبداللہ لطفی کے مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔ ہمارے رہنماؤں نے معاملہ کے ایک پہلو کو جانا مگر وہ معاملہ کے دوسرے پہلو سے بالکل بے خبر رہے۔ اور موجودہ دنیا میں جو لوگ اس قسم کی بے خبری کا ثبوت دیں، ان کے اقدامات کے لیے بدترین ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

وضو کی برکت

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے وضو کیا۔ پھر بہتر طریقہ پر وضو کیا، اس سے اس کی خطائیں جاتی رہتی ہیں۔ حتی کہ ناخن کے نیچے کی بھی (من توضأ فاحسن الوضوء خرجت خطایاہ حتی تخرج من تحت اظفارہ، رواہ مسلم)

بہتر وضو سے کیا مراد ہے، اس کی وضاحت دوسری روایتوں سے ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص بھی وضو کرے، پھر وہ اس کو پوری طرح کرے۔ اس کے بعد وہ کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، وہ جس دروازہ سے چاہے داخل ہو جائے (ما منکم من احدٍ یتوضأ فیبلغ الوضوء ثم قال: اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ الا فتحت لہ ابواب الجنۃ الثمانیۃ یدخل من ایّھا شاء، رواہ مسلم)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ کوئی شخص جب وضو کرے تو اس کے بعد یہ دعا پڑھے کہ خدایا مجھ کو توبہ کرنے والوں میں سے بنا، اور مجھ کو پاک صاف لوگوں میں سے بنا (اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین، الترمذی) ایک اور روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اس کے بعد آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ خدایا، مجھے خطاؤں سے پاک کر دے جس طرح سفید کپڑا دھو کر میل سے پاک کر دیا جاتا ہے (اللّٰھم نقّنی من الخطایا کما ینقّی الثوب الابیض من الدنس)

مختلف روایتوں میں یہ بات مختلف انداز سے بتائی گئی ہے کہ وضو سے آدمی کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ وضو اس کے گناہوں کے میل کو دھوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے

رب کے پاس اس حال میں پہنچتا ہے کہ وہ بالکل پاک صاف ہوتا ہے اور اس کو جنت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پانی سے ہاتھ پاؤں کو دھونا اپنے آپ آدمی کو گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ خطا اور گناہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے قلبی اعمال ہیں۔ ان کا تعلق آدمی کی نیت اور ارادہ سے ہے۔ اس لیے وہ اسی وقت دھل سکتے ہیں جب کہ آدمی کا قلب دھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی روایتیں اس انسان کے لیے ہیں جس کا جسمانی وضو اس کے لیے روحانی وضو بن جائے۔ جو وضو کا عمل اس طرح کرے کہ اسی کے ساتھ اس کا قلب اور ذہن بھی دھلتا چلا جائے۔ جس کی نفسیات اس کے وضو میں شامل ہو گئی ہو۔

ایک شخص جس کے دل میں اللہ کا خوف اور آخرت کا فکر سمایا ہوا ہو، وہ جب وضو کرتا ہے تو اس کے اندرونی احساسات کے اثر سے اس کا وضو کا عمل ایک ربانی عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا مادی عمل اس کی روحانی کیفیات کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ وضو کے ظاہری عمل میں مشغول ہوتے ہیں اور اس کا ذہن دعا اور ذکر کے باطنی عمل میں۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا ـــــ جس ہاتھ اور پاؤں اور چہرے کو آپ نے آج کے دن پانی سے دھویا ہے، اس کو کل کے دن اپنی رحمت سے دھو دیجئے۔ جس جسم کو آپ نے دنیا میں مادی اعتبار سے پاک کیا ہے، اس کو قیامت کے دن اپنی رحمت اور مغفرت کے نورانی غسل سے پاک کر دیجئے۔

جب ظاہری وضو کے ساتھ یہ باطنی وضو مل جائے تو یہی وہ وضو ہے جس کے بعد آدمی کے لیے جنت کے سب دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ تم جس دروازہ سے چاہو داخل ہو جاؤ۔

جسمانی وضو جسم کی پاکی ہے، اور روحانی وضو روح کی پاکی۔

مُردہ سے زندہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں پہونچے تو اللہ تعالیٰ نے ارض مقدس (شام وفلسطین) کو ان کے لیے لکھ دیا۔ حضرت موسیٰ کے ذریعہ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم لوگ اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ۔ تم کو خدا کی مدد ملے گی اور تم وہاں کے لوگوں پر غالب آجاؤ گے (المائدہ ۲۱)

وہاں جو قوم اس وقت آباد تھی، وہ بظاہر ایک طاقتور قوم تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل ان کا نام سن کر ڈر گیے۔ ان پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ خدا اور خدا کے رسول کی ہدایت کے باوجود ان کے خلاف اقدام کے لیے تیار نہ ہوئے (المائدہ ۲۲) بائبل میں ہے کہ: "تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی۔ اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے۔ اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے۔ اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی، ہائے کاش ہم مصر ہی میں مرجاتے۔ یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے۔ خداوند کیوں ہم کو اُس ملک میں لے جاکر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں" (گنتی ۱۴: ۱-۴)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوا کہ بنی اسرائیل چالیس سال (۱۴۰۰-۱۴۴۰ ق م) تک فاران اور شرقِ اُردن کے درمیان صحرا میں بھٹکتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان میں جو ۲۰ سال سے نیچے ہیں، صرف وہی زندہ بچیں گے۔ ۲۰ سال سے اوپر کی عمر کے تمام لوگ ختم ہو جائیں گے۔ چنانچہ ۴۰ سال کی صحرائی زندگی میں ان کے تمام بڑی عمر والے مرکر ختم ہوگیے۔ اس دوران ان کے بچے نئے صحرائی حالات میں پرورش پاکر نئی طاقت کے ساتھ اٹھے۔ اس نئی نسل نے یوشع بن نون کی قیادت میں ارضِ مقدس کو فتح کیا۔

بنی اسرائیل نے ابتداءً حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ اگر ہم اس ملک پر حملہ کریں تو ان کے مقابلہ میں ہم ہار جائیں گے۔ اور پھر "ہمارے بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے"۔ مگر یہی بچے بعد کو بڑے ہوکر شام وفلسطین کے علاقہ میں داخل ہوگیے اور وہاں کے حکمراں (عمالقہ) سے لڑکر

اس پر قبضہ حاصل کر لیا۔

بنی اسرائیل کے بچوں میں یہ طاقت کیسے پیدا ہوئی۔ وہ بے حوصلہ سے باحوصلہ کیونکر بن گیے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے باپ دادا کے برعکس، لمبی مدت تک صحرائی زندگی کی مشقتوں کو برداشت کیا۔ بچوں کے باپ جن سخت حالات کو اپنے بچوں کے حق میں موت سمجھتے تھے، انھیں سخت حالات کے اندر داخل ہونے میں ان بچوں کے لیے نئی زندگی کا راز چھپا ہوا تھا۔

موافق حالات میں زندگی گزارنا بظاہر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر موافق حالات ہمیشہ جمود پیدا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے اندر تمام اعلیٰ خصوصیتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ اس کو حالات کا مقابلہ کرکے زندہ رہنا پڑے۔ مصر میں بنی اسرائیل صدیوں تک عافیت کی زندگی گذارتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک مردہ قوم بن گیے۔ مگر مصر سے خروج کے بعد ان کو غیر آباد صحرا میں زندگی گزارنی پڑی۔ یہ صحرائی زندگی ان کے لیے سراپا چیلنج تھی۔ ان پر مشقت حالات میں جو لوگ بچپن سے جوانی کی عمر کو پہونچے وہ قدرتی طور پر بالکل دوسری قسم کے انسان تھے۔

بنی اسرائیل کی یہ نسل اخلاق و کردار کے اعتبار سے اپنے باپ دادا سے بالکل مختلف تھی۔ صحرائی حالات نے ان کے اندر سادگی، جفاکشی، حوصلہ اور حقیقت پسندی جیسی خصوصیات پیدا کر دی تھیں۔ اور بلاشبہ یہی وہ اوصاف ہیں جو کسی قوم کے افراد کو زندہ افراد بناتے ہیں۔ کوئی قوم اگر طول امد (الحدید ۱۶) کے نتیجہ میں مردہ قوم بن جائے تو اس کو دوبارہ زندہ قوم بنانے کی تدبیر یہی ہے کہ اس کو غیر معمولی حالات میں ڈالا جائے۔ اور اس کو ایسے شدید عمل سے گزارا جائے جس کے دوران اس کی سابقہ غیر مطلوب شخصیت ختم ہو اور نئی مطلوب شخصیت ابھر آئے۔

اسلوبِ عصر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے جو رسول بھی بھیجا اس کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان سے بیان کردے (وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ لیبین لھم ، ابراہیم ۴)

پیغمبر، اور پیغمبر کے بعد اس کی تبعیت میں داعی، لسانِ قوم میں کلام کرتا ہے۔ اس اندازِ کلام کی اہمیت دعوت کے اعتبار سے بھی ہے اور تربیت کے اعتبار سے بھی۔ جو لوگ دین کے دائرہ سے باہر ہیں، ان کے لیے لسانِ عصر میں کلام کرنے کی ضرورت اس لیے ہے تاکہ وہ اس کو پوری طرح سمجھیں اور ان کے اوپر خدا کے دین کی حجت تمام ہوسکے۔ اگر لسانِ غیر قوم یا لسانِ غیر عصر میں کلام کیا جائے تو دعوت پہونچانے کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس بنا پر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان پر حجت تمام کردی گئی ہے۔

جو لوگ اسلام کے دائرہ میں داخل ہیں، ان کے لیے لسانِ قوم یا زمانہ میں رائج اسلوب کی اہمیت تربیت کے اعتبار سے ہے۔ کوئی بات جب تک مخاطب کی اپنی زبان یا اس کے اپنے قابل فہم اسلوب میں نہ کہی جائے وہ اس کے ذہن کا جزء نہیں بنتی، وہ اس کے اندر شعوری انقلاب بن کر داخل نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: الید العلیا خیر من الید السفلیٰ (اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے) اگر آپ اس حدیث کا صرف ترجمہ کردیں یا روایتی طور پر صرف یہ بتادیں کہ صدقہ دینے والا ہاتھ صدقہ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے تو وہ اتنی شدت کے ساتھ سننے والے کے ذہن میں جگہ نہیں بنا سکتا جیسا کہ فی الواقع اس سے مطلوب ہے۔

لیکن، اگر آپ اس کو جدید زبان میں اس طرح کہیے کہ اس حدیث میں دینے والے گروہ (Giver group) اور لینے والے گروہ (Taker group) کا فرق بتایا گیا ہے، تو آج کا انسان فوراً اس کی معنوی اہمیت کو سمجھ لے گا۔ کیوں کہ یہ آج کی زبان ہے، اور کسی بات کو جب آج کی زبان میں کہہ دیا جائے تو وہ آج کے ذہن میں پوری طرح اتر جاتی ہے۔ وہ اس کے شعوری فکر کا جزء بن کر اس کے اندر داخل ہوجاتی ہے۔

فخر نہیں

۵ مئی ۱۹۸۹ کو جمعہ کا دن تھا۔ میں نے دہلی کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ امام صاحب نے خطبہ سے پہلے تقریباً ۲۰ منٹ تک ایک پرجوش تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا :

ہم کو فخر ہونا چاہیے کہ ہم ایک اللہ کو ماننے والے ہیں

یہ جملہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات کی نہایت صحیح ترجمانی کر رہا ہے۔ آج کل کے مسلمان، خاص طور پر ان کا رہنما طبقہ، تقریباً سب کا سب اسی نفسیات میں مبتلا ہے۔ وہ اسلام کو اپنے لیے فخر کی چیز سمجھتا ہے۔ یہ بلاشبہ گمراہی ہے۔ بلکہ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ان کو خدا کی مدد سے محروم کر رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے درمیان انتہائی بڑی بڑی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ مگر وہ ان کی بربادی کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ نہیں کرتیں۔

مذکورہ جملہ میں کیا غلطی ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کچھ لوگ چل رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں کہ ان میں سے ایک شخص کی نظر اچانک قریب کی ایک جھاڑی پر پڑتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہاں ایک زندہ شیر کھڑا ہوا ہے۔ اس وقت آدمی کی زبان سے کیا الفاظ نکلیں گے۔ کیا وہ کہے گا کہ :

ہم کو فخر ہونا چاہیے کہ ہم اس وقت ایک زندہ شیر کے سامنے ہیں

ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ شیر کو دیکھ کر آدمی کے اوپر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ اور جو چیز ہیبت طاری کرے، اس کے بارہ میں اس کے اندر عجز کا احساس جاگے گا نہ کہ فخر کا احساس۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اللہ کا ہے جو شیر کا خالق ہے۔ اللہ ایک ایسی ہستی ہے جو سب کے اوپر ہے، جو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ ایسی ایک ہستی کا یقین آدمی کے اندر عجز اور تواضع کا جذبہ پیدا کرے گا نہ کہ فخر اور ناز کا جذبہ۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا تعارف ہے۔ اللہ کی ہستی کیا ہے، سارا قرآن اس کے بیان سے بھرا ہوا ہے۔

یہاں اس سلسلہ میں قرآن سے چند آیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے۔ سب کو تھامے ہوئے ہے۔ اس کو نہ اونگھ لگتی۔ اور نہ نیند آتی۔ زمین میں اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے سفارش کرسکے۔ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے سب کا اسے علم ہے۔ اس کے علم کے کسی گوشہ پر بھی کوئی شخص حاوی نہیں ہوسکتا مگر جو وہ چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔ ان کی نگہبانی اس کے لیے تھکا دینے والا کام نہیں۔ وہی سب سے اوپر ہے، وہی سب سے بڑا ہے (البقرہ ۲۵۵)

تم لوگ اللہ سے ڈرو اور آپس کے معاملات درست رکھو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔ ایمان والے تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں (الانفال ۱-۲)

اور لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ اور زمین ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں (الزمر ۶۷)

اس طرح کی کتنی ہی آیتیں قرآن میں شروع سے آخر تک موجود ہیں جو اللہ کا تعارف ایسے انداز میں کراتی ہیں کہ ان کو پڑھ کر آدمی لرز اٹھے۔ اللہ کے عظمت وجلال سے اس پر ہیبت طاری ہوجائے۔ قرآن میں یہ بات تو کثرت سے مذکور ہے کہ اللہ پر ایمان والے اللہ کی یاد سے کانپ اٹھتے ہیں، اس کے ذکر سے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ بات سارے قرآن میں کہیں نہیں کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو اللہ پر فخر ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے ماننے والوں نے ابھی خدا کو نہیں جانا۔ اگر وہ خدا کو ماننے والے ہوتے تو خدا کا تصور ان کے اندر عجز اور تواضع کی کیفیت پیدا کرتا۔ خدا کا نام لیتے ہوئے ان کی زبان کانپ اٹھتی، نہ کہ خدا کا نام لے کر وہ فخر و ناز کی باتیں کرنے لگیں۔

کہاں سے کہاں

مسٹر ہیم وتی نندن بہوگنا ہندستان کے ایک مشہور سیاسی لیڈر تھے۔ وہ امریکہ میں کلیولینڈ (Cleveland) کے اسپتال میں زیر علاج تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۹۸۹ کو اسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ بوقت انتقال ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مارچ ۱۹۸۹، صفحہ ۱۳) میں ان کے حالات درج کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ مسٹر بہوگنا نے اپنی زندگی میں غیر معمولی سیاسی شہرت حاصل کی، اور آخر میں تقریباً تنہائی کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے تمام دوست ایک کے بعد ایک انھیں چھوڑتے چلے گیے۔ ان کے سیاسی شریک کار ان سے جدا ہوگیے۔ اور، ۴۵ سالہ سیاسی زندگی کے آخر میں، انھوں نے اپنے آپ کو تنہائی کے بیابان میں پایا:

One by one, his friends left him, his political allies deserted him and, at the end of a political career spanning 45 years, he found himself in near wilderness (p. 13).

تبصرہ نگار نے یہاں مسٹر بہوگنا کا جو انجام بتایا ہے، وہی انجام وسیع تر پیمانہ پر ہر شخص کا ہونے والا ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی شاندار "۴۵ سالہ" زندگی گزار رہا ہے، صرف اس لیے تاکہ اچانک اس کی شاندار زندگی کا خاتمہ ہو جائے اور وہ موت کے دروازہ سے گزار کر خدا کی عدالت میں پہونچا دیا جائے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کو "۴۵ سال" ملتے ہیں۔ یہ مدت اس لیے نہیں ہے کہ وہ اپنا شاندار سیاسی کیریر بنائے۔ وہ صرف اس لیے ہے کہ آدمی آنے والے مستقبل کی ابتدائی تیاری کرے۔ جو لوگ اپنے "۴۵ سال" کو تیاری کا ابتدائی وقفہ سمجھیں اور اس کے لیے اسے استعمال کریں وہ آنے والے مستقل مرحلہ میں کامیاب رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے "۴۵ سال" ہی کو سب کچھ سمجھ لیں، ان کا حال اس انسان کا سا ہوگا جو بیج ڈالنے سے پہلے پھل حاصل کرنا چاہے۔ ایسے شخص کے لیے آنے والی دنیا میں ابدی ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

کیسا عجیب ہے انسان کا شاندار حال، اور کیسا غیر شاندار ہے اس کا آخری مستقبل۔

صغیر احمد اسلم صاحب نے بتایا کہ ۱۹۶۹ میں وہ لاس اینجلیس کی ایک بڑی فرم میں ۳۵ اسٹور کے منیجر تھے۔ ان کو اپنے امریکی افسر کے ساتھ سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ جنرل منیجر تقریباً ۳۵ سال کا تھا۔ اور ہوٹل کے زمانہ قیام میں شراب اور عیاشی کے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ صغیر اسلم صاحب ایک با اصول آدمی تھے۔ ان کو اس قسم کی باتیں پسند نہ تھیں۔ آخر ایک سفر میں وہ جنرل منیجر کے کمرہ میں گیے اور دروازہ بند کرکے اس سے نہایت سخت گفتگو کی ——— تم عیاش ہو، تم بالکل نکمے ہو، تم بزنس کرنا نہیں جانتے، وغیرہ۔

صغیر اسلم صاحب جنرل منیجر کو بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد جب باہر جانے لگے تو جنرل منیجر نے ان کو پکڑ کر واپس بلایا اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ ہاں، تم اس کمپنی کے مالک ہو۔ اس نے کہا کہ پھر تمہارے اندر یہ جرأت (Courage) کہاں سے آئی کہ تم مجھ کو اس طرح خطاب کرو۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ تم یہی تو کر سکتے ہو کہ مجھ کو فائر (برخاست) کر دو، تو میں اس سے پہلے کمپنی سے اپنا استعفا تیار کر چکا ہوں۔ اس نے کہا کہ فائر کرنا تو درکنار، میں تم کو چھوڑوں گا بھی نہیں، تم ہماری کمپنی کے لیے بہت قیمتی ہو۔

اس شخص کا نام جب اسٹوارٹ میگروڈر (Jeb Stuart Magruder) تھا۔ میں نے صغیر اسلم صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس کے ساتھ اتنی سخت گفتگو کی، پھر بھی وہ آپ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا، اس کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جانتا تھا کہ میں کمپنی کے لیے ایک مفید شخص ہوں۔ اپنے ذاتی جذبات پر اس نے کمپنی کے مفاد کو غالب رکھا۔

مذکورہ امریکی نے ذاتی رنجش کے باوجود صغیر اسلم صاحب کی قدر دانی کی۔ یہ اعتراف اور یہ بلند حوصلگی جو امریکہ کے ایک شرابی میں پائی جاتی ہے، وہ آج ہماری بڑی بڑی دینی شخصیتوں میں بھی موجود نہیں۔ ذاتی رنجش کے بعد کسی کی صلاحیت کا اعتراف بلاشبہ اعلیٰ ترین اخلاقی قدر ہے، مگر ہمارے تمام اکابر اس اخلاقی قدر سے مکمل طور پر خالی ہیں۔

ایک امریکی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ اس کا ایک پاؤں کسی حادثہ میں ضائع ہو گیا تھا اور اس کی جگہ اس نے مصنوعی پاؤں لگا رکھا تھا۔ یہ نوجوان ایک پرکشش شخصیت کا مالک تھا، مگر پاؤں کا کھونا اس کے لیے ایک ناقابل تلافی محرومی بنا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ

انسان کا جسم ایک بے حد قیمتی مشین ہے۔ مگر اس مشین کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی کارخانہ نہیں جہاں اس زندہ مشین کے اسپیر پارٹ (Spare Parts) تیار ہوتے ہوں۔ انسان کے لیے اپنی کمیوں کی تلافی کی صورت صرف ایک ہے ——— وہ اپنے خالق کو راضی کرے تاکہ بعد کو آنے والی دنیا میں وہ اس کو ایک ابدی اور بے نقص جسم عطا کردے۔

ایک تعلیم یافتہ عیسائی نے کہا کہ میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ مگر بعض سوالات میرے ذہن کو الجھا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون سے سوالات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں غلامی کا مسئلہ، پیغمبر کا کئی شادیاں کرنا، حجر اسود کو چومنا، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ اسلام یا کسی بھی نظام کا مطالعہ کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں۔ ہر مذہب یا ہر نظام میں کچھ بنیادی چیزیں ہوتی ہیں اور کچھ فروعی چیزیں۔ ایک سنجیدہ متلاشی کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ پہلے زیر مطالعہ مذہب یا نظام کی بنیادی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے جب ان کے بارہ میں پوری واقفیت حاصل ہو جائے، اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ فروعی یا ضمنی باتوں کو سمجھا جائے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ امریکہ کے نظام تہذیب کو سمجھنا چاہیں تو اس کا آغاز آپ یہاں سے نہیں کریں گے کہ امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن اپنی جیب میں ہمیشہ سونے کی نعل کیوں رکھتے تھے۔ مطالعہ کا یہ طریقہ درست نہ ہوگا۔ اس کے برعکس آپ یہ کریں گے کہ پہلے امریکہ کی تاریخ، اس کے علوم، اس کے قانون اور اس کے صنعتی اور تجارتی طریقوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ یہی طریقہ علمی طریقہ ہے اور یہی طریقہ آپ کو اسلام کے مطالعہ میں بھی اختیار کرنا چاہیے۔

یہاں بہت سے نومسلم امریکیوں سے ملاقات ہوئی۔ مثلاً ۳۹ سالہ پال یوسف جیول (Paul Yusuf Jewell) جو سفید فام نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور سراج وہاج جو سیاہ فام نسل میں پیدا ہوئے اور پھر اسلام قبول کیا۔ کانفرنس میں بھی بڑی تعداد میں نومسلم امریکی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض نے وہاں تقریریں بھی کیں۔

ایک خاص بات یہ محسوس ہوئی کہ نومسلم امریکیوں میں، دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں، زیادہ ایمانی جوش اور زیادہ جذبۂ عمل پایا جاتا ہے۔ لوگوں کے ذریعہ یہاں کے جو حالات معلوم

ہوئے، ان سے اندازہ ہوا کہ یہاں کی سیاہ فام نسل میں اسلام کی اشاعت کے زبردست امکانات پائے جاتے ہیں۔ اگر یہاں کے مسلمانوں میں دعوتی جذبہ پوری طرح بیدار ہو جائے اور وہ سیاہ فام نسل میں اسلام کی تبلیغ بڑے پیمانہ پر شروع کر دیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی پوری قوم اسلام میں داخل ہو جائے۔

امریکہ میں اظہار خیال اور اشاعت افکار کی مکمل آزادی ہے۔ یہاں وہ منافقت بھی نہیں کہ کاغذ پر کچھ لکھا ہو اور عمل کسی اور چیز پر کیا جاتا ہو۔ مسلمان اگر اس امکان کو استعمال کریں اور یہاں کی سیاہ فام نسل کو اسلام کے حلقہ میں داخل کر لیں تو اس کے بعد امریکہ میں ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو جائے گا۔

امریکہ میں اس وقت یہودی غلبہ قائم ہے۔ اگر مذکورہ واقعہ رونما ہو سکے تو یہ منحوس غلبہ ختم ہو کر یہاں ایک نیا صحت مند غلبہ شروع ہو جائے گا۔ بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ امریکیوں کے خیالات سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ یہاں کے سنجیدہ لوگ یہودی غلبہ کو بالکل پسند نہیں کرتے مگر اسلام کے سوا کوئی چیز نہیں جو امریکہ سے اس منحوس غلبہ کو ختم کر سکے۔ یہاں آکر اسلام خود امریکہ کی اپنی ایک ضرورت بن جاتا ہے۔

پاکستان میں راقم الحروف کی تمام کتابیں چھپ گئی ہیں اور وہاں عام طور پر ملتی ہیں۔ یہاں کے ایک پاکستانی مسلمان نے کراچی سے "ظہور اسلام" حاصل کی تھی اور اس کو پڑھ چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے اس کتاب کے ایک باب (حسنین: تاریخ کے دو علامتی کردار) میں نواسۂ رسول کے خلاف قلم اٹھایا ہے، یہ کہاں تک درست ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے کہ حسین کے عمل کے مقابلہ میں حسن کے عمل کو ترجیح دی ہے، اور وہ بھی بہر حال نواسۂ رسول تھے۔

پھر میں نے کہا کہ حسین اور حسن کا معاملہ امت کے لیے ایک آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے اسلام کی ابتدائی تاریخ میں دو رول ماڈل (Role models) رکھ دیئے تھے۔ ایک رول ماڈل (نمونۂ عمل) حسین کا، جس سے امت کو باہمی خوں ریزی کے سوا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ دوسرا رول ماڈل حسن کا، جس سے اسلام اور امت اسلام کو زبردست فائدے

حاصل ہوئے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ظہور اسلام)

اب اللہ آپ کا امتحان لے رہا ہے کہ آپ دونوں میں سے کس رول ماڈل کو اپنے لیے اختیار کرتے ہیں۔ حسین کے رول ماڈل میں چونکہ جاہ طلب اور سیاست پسند لوگوں کے لیے گنجائش نکلتی ہے، اس لیے لوگ اس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس رول ماڈل کو اپنایا، انھوں نے دوبارہ اسلام کی تاریخ میں بربادی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ جب کہ حسن کا رول ماڈل اپنانے والوں نے ہمیشہ تاریخ میں مثبت اضافے کیے ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے دیکھا کہ ایک صاحب روس کو برا کہہ رہے ہیں اور دوسرے صاحب امریکہ کو۔ میں نے کہا کہ روس اور امریکہ میں داخلی حالات کے اعتبار سے ضرور فرق ہے، مگر جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، دونوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں۔ دونوں میں سے کسی کی بھی خارجہ پالیسی اصول کی بنیاد پر قائم نہیں۔ وہ تمام تر استحصال کی بنیاد پر چلائی جا رہی ہے۔

مثلاً افغانستان اور فلسطین کے معاملہ کو تقابلی طور پر دیکھئے۔ افغانستان میں روس مقامی کمیونسٹ عناصر کا حامی ہے، اور امریکہ مقامی مسلم مجاہدین کا۔ اس کے برعکس فلسطین میں امریکہ اسرائیل کا حامی اور سرپرست بنا ہوا ہے، اور روس فلسطینی مسلمانوں کی تنظیم کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ گویا افغانستان میں روس امریکی کردار ادا کر رہا ہے اور فلسطین میں امریکہ روسی کردار ادا کرنے میں مشغول ہے۔

اس اعتبار سے جنرل ضیاء الحق اور ڈاکٹر نجیب اللہ دونوں کا کیس، باعتبار نوعیت تقریباً یکساں ہے۔ ضیاء الحق امریکہ نواز پالیسی پر کاربند تھے، اس لیے وہ امریکہ کے مطلوب شخص بن گئے۔ اس کے برعکس نجیب اللہ روس نواز پالیسی پر عامل ہیں، اس لیے وہ روس کے مطلوب شخص بنے ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات بھی بڑی عجیب ہے۔ امریکہ ظالم اسرائیل کی حمایت کر کے مسلم دنیا کے لیے سب سے بڑا مسئلہ پیدا کیے ہوئے ہے۔ ضیاء الحق اسی امریکہ کے حامی بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ضیاء الحق کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے اکابر ان

کو مجاہد اسلام کا ٹائیٹل عطا کریں۔ دوسری طرف نجیب اللہ اشتراکی روس کے حامی بنتے ہیں تو ان کے حصہ میں یہ بدقسمتی آتی ہے کہ اکابر ملت ان کو غدار کے لقب سے نوازتے ہیں۔

ایک دیندار مسلمان سے پاکستان کے الکشن (نومبر ۱۹۸۸) کے بارہ میں گفتگو ہوئی جس میں اسلامی اتحاد کو شکست دے کر بے نظیر بھٹو نے کامیابی حاصل کی ہے، اور اب وہ کسی مسلم ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم کی حیثیت حاصل کیے ہوئے ہیں۔ مذکورہ مسلمان نے اس پر اپنے درد کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "سقوط خلافت کے بعد یہ مسلم دنیا کے لیے دوسرا سب سے بڑا حادثہ ہے"۔ میں نے کہا کہ ایک لفظی ترمیم کے ساتھ مجھے آپ کے تبصرہ سے اتفاق ہے۔ وہ یہ کہ ——— سقوط خلافت کے بعد یہ مسلم دنیا کے لیے دوسرا سب سے بڑا سبق ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد ترک خلافت کی حمایت میں جو ہنگامہ خیز تحریک چلائی گئی، وہ گویا دیمک زدہ لکڑی پر "ملٹی اسٹوری بلڈنگ" کھڑا کرنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ عین فطری قانون کے مطابق وہ ناکام ہوگئی۔ اسی طرح پاکستان میں اسلامائزیشن کا ساڑھے گیارہ سالہ فوجی عمل کیا گیا۔ وہ بھی گویا بیج ڈالے بغیر پھاوڑے کے ذریعہ فصل کاٹنے کی کوشش تھی جو دوبارہ خود فطری قانون کے تحت بے فائدہ ثابت ہوئی۔

پیغمبرانہ طریقہ تزکیہ اور تدریج کا طریقہ ہے۔ یعنی پہلے ذہن بنایا جائے، اس کے بعد دھیرے دھیرے عملی احکام کا نفاذ کیا جائے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر حالات پیدا کیے بغیر نہ بین اقوامی اسلامی خلافت قائم ہوسکتی اور نہ قومی اسلامی حکومت۔ مگر مسلم رہنماؤں نے یہ اصلی اسلامی سبق نہ پہلے لیا اور نہ اب وہ ایسا سبق لے رہے ہیں۔ جس واقعہ سے سبق کی غذا حاصل کرنا تھا، اس کو وہ ماتم سرائی کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

امریکہ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے دہلی میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں پر مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کی دنیا میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ بے قیمت ہے تو وہ ہندستانی مسلمان ہے، مگر امریکہ کے سفر میں مجھ کو جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کے بعد اندازہ ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان آج سونے اور چاندی سے بھی زیادہ قیمتی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں مجھے معلوم ہوا کہ جو مسلم قائدین ہندستان میں "مسلمان خطرہ میں" والی سیاست کے چیمپین بنے ہوئے ہیں۔ وہ دراصل ہندستانی مسلمانوں کی لاشوں کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ لوگ امریکہ میں (اور اسی طرح دوسرے دولت مند ملکوں میں) جاتے ہیں اور وہاں مسلمانوں کے اوپر ظلم کی داستانیں بتا کر بہت بڑی بڑی رقمیں حاصل کرتے ہیں۔ ہندستان کے اور دوسرے ملکوں کے مسلمان جو یہاں کافی دولت کمارہے ہیں، ظلم اور تعصب کی داستانیں سن کر ان کے اندر قومی ہمدردی کا جذبہ جاگتا ہے، اور وہ مختلف طریقوں سے بڑی مقدار میں رقمیں جمع کر کے ان نام نہاد قائدین کو دیدیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قائدین لاشوں کے تاجر ہیں، اگرچہ نادان لوگ ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھے ہوئے ہیں۔

امریکی معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تقریباً ہر آدمی مقروض ہوتا ہے۔ کار، مکان اور اس طرح کی دوسری قیمتی چیزیں عام بینکوں سے سودی قرض لے کر حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ قرض محدود آمدنی والے بھی لیتے ہیں اور زیادہ آمدنی والے بھی۔ محدود آمدنی والوں کے لیے وہ ایک ضرورت ہے۔ عام طور پر لوگ اپنا خرچ بڑھائے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ رقم پس انداز نہیں کر پاتے اور قیمتی چیزیں حاصل کرنے کے لیے انھیں بینکوں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ تاہم بزنس والے لوگ جن کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے، وہ بھی تقریباً صد فی صد مکانات قرض پر حاصل کرتے ہیں۔

ڈکٹور کمال کامل عبدالحمید نمر (پیدائش ۱۹۳۷) ایک فلسطینی عرب ہیں۔ وہ تقریباً دس سال سے امریکہ میں ہیں۔ آج کل وہ سعودی اکیڈمی (واشنگٹن) میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے امریکی مسلمانوں کے بارہ میں کئی سال تک ریسرچ کی ہے اور اس موضوع پر وسیع معلومات رکھتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ کولمبس سے بہت پہلے دسویں صدی عیسوی میں اسپین کے آٹھ مسلمان امریکہ کے جنوبی ساحل پر اتر چکے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ آج تو یہاں بسنے والے عرب خاندان اپنی عربی زبان بھول چکے ہیں۔ ان کی بیشتر تعداد نے عیسائی عورتوں سے شادیاں کر لی ہیں۔ مگر ان کو ایک بوڑھی عرب خاتون نے بتایا کہ میرے والد ۱۸۸۵ میں امریکہ آنے کے لیے کشتی پر سوار ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا امریکہ میں مسجد ہے۔ کشتی والوں نے بتایا کہ نہیں۔ وہ ایسے کافر ملک میں جانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور فوراً کشتی سے اتر آئے (خشی ان یھاجر الی بلاد الکفر تلك واسرع بمغادرة القارب علی الفور)

اسی طرح انھوں نے اور بہت سی معلوماتی باتیں بتائیں۔ ۱۸۹۲ میں امریکہ کا پہلا عربی رسالہ جاری ہوا جس کا نام "کوکب امریکا" تھا۔ نارتھ ڈاکوٹا کے شہر روس (Russ) میں یہاں کا پہلا جمعہ ۱۹۰۰ میں قائم ہوا۔ مشی گان کے شہر ہائلینڈ پارک میں ۱۹۱۹ میں پہلی باقاعدہ مسجد تعمیر کی گئی۔ مگر افسوس کہ اب وہ چرچ ہے (وھو الآن مع الاسف کنیسۃ) اس وقت امریکہ میں ۱۰۰ سے زیادہ باقاعدہ مسجدیں ہیں۔ گھروں کی سیکڑوں مسجدیں اس کے علاوہ ہیں۔

انھوں نے ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ ۱۸۵۶ میں امریکہ نے عرب سے ۳۳ اونٹ خریدے تھے جو کشتی کے ذریعہ امریکہ لائے گیے تاکہ یہاں کے جنوبی علاقہ میں ان سے بار برداری کا کام لیا جاسکے۔ مگر آج یہ حال ہے کہ خود عرب ممالک امریکہ سے کار اور ہوائی جہاز خرید رہے ہیں۔

ان کے بیان کے مطابق، عربوں کے مقابلہ میں دوسری قوموں کے لوگ اپنی زبان اور اپنے کلچر کی حفاظت کے معاملہ میں زیادہ سخت ہیں۔ ایک عرب ایک بار ایک یہودی کے گھر گیے۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کا لڑکا ایک کونے میں دونوں ہاتھ اوپر کیے ہوئے ایک پاؤں پر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ دریافت کرنے پر یہودی نے بتایا کہ میں اس سے کہتا ہوں کہ گھر کے اندر عبرانی زبان بولو مگر وہ نہیں بولتا۔ اسی کی یہ سزا ہے۔ ایک بوڑھے عرب نے انھیں بتایا کہ میرے لڑکے عرب اخلاق اور عرب زبان کو بھول چکے ہیں۔ اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرا اپنا گناہ ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو امریکہ میں لاکر جرم کیا ہے (إنه ذنبي انا۔ لقد اجرمت باحضار ابنائي الى امريكا)

نئی نسل اگرچہ امریکی سماج میں گھل مل گئی ہے۔ مگر قدیم نسل سخت غیر مطمئن ہے۔ ایک بوڑھا عرب جو امریکہ کا شہری بن چکا ہے اور یہاں خوش حال زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے ڈکٹور نمر سے کہا کہ میری بدقسمتی ہے کہ میں امریکہ کے موٹر ساز کارخانہ میں محنت کرکے ڈالر کماتا رہا۔ یہی محنت اگر میں خود اپنے ملک میں کرتا تو وہاں بھی میں اپنے لیے ایک اچھی زندگی بنا سکتا تھا (ولسوء الحظ فقد بذلت من الجهد في مصانع السيارات ما ان لو بذلته في بلدي لعشت افضل حياة)

امریکہ کے مسلمان مجھے ایک بڑے تضاد میں مبتلا نظر آئے۔ یہاں آپ جس مسلمان سے بھی ملیں

وہ آپ کو اس غم میں مبتلا نظر آئے گا کہ اس کے بچے "اسلامی تہذیب" سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ دوسری طرف ان مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص (الا ماشاء اللہ) سودی قرض پر زندگی گزار رہا ہے۔ بچوں کی تہذیبی شناخت کے معاملہ میں ان کا اسلامی احساس زندہ ہے، مگر اپنے آپ کو سودی قرض سے بچانے کے معاملہ میں ان کا اسلامی احساس زندہ نہیں۔

یہاں عام طور پر لوگ دو سبب سے سودی قرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک شخص ہے جس نے نیا نیا روزگار حاصل کیا ہے۔ اس کے پاس اپنے روزمرہ کے خرچ کے لیے تو معقول رقم ہوگی۔ مگر اس کے پاس اتنی رقم نہ ہوگی کہ وہ فوراً کار اور مکان بھی حاصل کرلے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ وہ دس سال تک کما کر رقم بچائے اور دس سال کے بعد کار اور مکان حاصل کرے۔ مگر ماحول کے زیر اثر وہ اس انتظار پر راضی نہیں ہوتا اور فوراً ہی کار اور مکان کا مالک بن جانا چاہتا ہے۔ یہاں بینک اس کی مدد کرتا ہے اور کار اور مکان اور دوسری قیمتی چیزوں کے لیے اس کو سودی قرض فراہم کردیتا ہے۔ اس طرح آدمی سودی قرض میں پھنس جاتا ہے اور پھر تمام عمر اس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس رقم موجود ہوتی ہے (مثلاً تاجر حضرات) مگر وہ بھی مکان جیسی زیادہ قیمتی چیزوں کو نقد خریدنا پسند نہیں کرتے۔ وہ بینک سے قرض لے کر مکان خریدتے ہیں اور خود اپنی رقم کو کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بینک کو جتنا سود ادا کریں گے، اس سے زیادہ وہ کاروبار میں نفع کما کر حاصل کرلیں گے۔

امریکی مسلمانوں کا یہ تضاد بتاتا ہے کہ اپنے بچوں کی تہذیبی پہچان کے لیے ان کا غم اسلامی غم نہیں ہے۔ اگر وہ اسلامی غم ہوتا تو اس کا اثر دونوں معاملات میں ظاہر ہوتا۔ یہ قومی جذبہ کے تحت ہے نہ کہ حقیقۃً اسلامی جذبہ کے تحت۔ اور یہ قومی جذبہ جس طرح مسلمانوں میں ہے اسی طرح وہ پوری شدت کے ساتھ دوسری قوموں میں بھی پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو مسٹر رام بکسانی کا بیان، مطبوعہ قومی آواز، ۴ جنوری ۱۹۸۸، صفحہ ۲)

اس معاملہ کا اس سے بھی زیادہ عجیب پہلو یہ ہے کہ یہاں کے تمام مسلمان اس بات کی شکایت کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ امریکہ کی اقتصادیات پر یہودیوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ یہاں

کی بینکنگ پوری طرح ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ یہاں کی دولت پر قبضہ کرکے اس کو بھرپور طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ مگر یہ بات صرف زبانی مذمت تک محدود ہے۔ عملی طور پر یہاں کا تقریباً ہر مسلمان یہودی اقتصادی اداروں سے سودی قرض لے کر ان کو تاعمر اپنی کمائی کا ایک حصہ ادا کرتا ہے تاکہ وہ خود اس کے اپنے اقرار کے مطابق، اس کو اسلام اور مسلمانوں کی جڑ اکھاڑنے میں لگائیں۔

لاس اینجلیس کی ایک خاتون بلی روتھ (Billie Ruth) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ قبول اسلام کا سبب پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میں ۱۸ سال پہلے کی عمر میں چرچ جاتی تھی۔ وہاں مجھے مسیحیت کے بارہ میں عجیب تجربہ ہوا۔ میں نے پایا کہ جو کچھ میں بائبل میں پڑھتی ہوں اور جو کچھ میں چرچ کے اندر سنتی ہوں، دونوں ایک نہیں ہیں۔ میں نے سوال کرنا شروع کیا اور چرچ سوسائٹی کو چھوڑ دیا:

I found that what I read in the Bible and what I heard in the Church was not the same. I started questioning and I dropped out of church society.

بعد کے مرحلہ میں انھوں نے قرآن کو پڑھا اور اسلام قبول کرکے ایک انڈونیشی مسلمان (سلیمان) سے شادی کر لی، مطالعہ کے بعد انھوں نے پایا کہ اسلام واحد مذہب ہے جس میں جو کچھ لکھا ہے وہی بتایا بھی جاتا ہے:

Islam is the only religion that reads and teaches the same.

بعض لوگ اس واقعہ کو اسلامی دعوت کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی عملی زندگیاں اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر یہ صورت حال کسی بھی درجہ میں اسلامی دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ عیسائیت ایک منظم مذہب ہے، اس بنا پر اس میں مذہب کے دو معیار بن گیے ہیں۔ ایک ان کا چرچ، دوسرے ان کی کتاب مقدس۔ ان دونوں میں اگر فرق یا تضاد ہو تو وہ خود مسیحی مذہب کو مشتبہ قرار دینے کا سبب بن جائے گا۔ اس کے برعکس اسلام میں اصل معیار صرف ایک ہے

اور وہ اس کی کتاب مقدس ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا خلاف اسلام عمل، خالص نظریاتی اعتبار سے، اسلامی دعوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ مسیحیت میں ریڈنگ اور ٹیچنگ کا فرق پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے برعکس، اسلام میں صرف ریڈنگ اور پریکٹس کا۔

امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان نومسلموں کے ذریعہ وہی دعوتی عمل دوبارہ زندہ ہونا چاہیے تھا جو دور اول کے نومسلموں کے ذریعہ ساری دنیا میں زندہ ہوا تھا۔ مگر عملاً ایسا نہ ہوسکا۔ محمد علی کلے (پیدائش ۱۹۴۲) ایک امریکی نومسلم ہیں۔ ان کے اندر ابتداءً دعوت کا جذبہ تھا۔ مگر شاید میں عظیم ہوں (I am the greatest) کے شوق نے وہ چھٹکارا حاصل نہ کرسکے۔ اپنے کو سب سے بڑا ثابت کرنے کے لیے وہ بار بار باکسنگ کا خوفناک کھیل کھیلتے رہے۔ آخری کھیل (۱۹۸۱) ان کے لیے سخت مہلک ثابت ہوا۔ ان کے سر میں ایسی چوٹیں آئیں جس سے ان کا دماغی توازن بگڑ گیا۔

محمد علی کے پاس شکاگو میں ۱۶ کمروں کا نہایت وسیع مکان ہے۔ وہ دو فارم کے مالک ہیں۔ جدید ترین گاڑیوں کا ایک پورا دستہ موجود ہے۔ بہت بڑا بینک بیلنس اس کے علاوہ ہے۔ مگر محمد علی اب خود کچھ بھی نہیں۔ وہ آج ایک ختم شدہ طاقت (Spent force) بن چکے ہیں۔ اب وہ عام انسان کی حیثیت سے بھی زندگی گزارنے کے قابل نہیں، اسلامی داعی کی ذمہ داریوں کو ادا کرنا تو درکنار۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب مثال بلی روتھ سلیمان (Billie Ruth Suleiman) کی ہے۔ اس امریکی نومسلمہ سے پوچھا گیا کہ زندگی میں آپ کی خواہش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے مدینہ سے گہری محبت ہے۔ اگر مجھے رہنے کے لیے کوئی ایک جگہ دی جائے تو میں پیغمبر کی مسجد کے قریب ترین رہنا پسند کروں گی:

O, I have deep love for Madina. If I were given one place to live, I would choose to be as close as possible to the Prophet's Mosque.

میرا خیال ہے کہ اس قسم کے احساسات موجودہ مسلم سماج کا نتیجہ ہیں نہ کہ اسلامی تعلیمات کا۔ موجودہ مسلمان نہ صرف یہ کہ خود اسلامی دعوت کا کام نہیں کررہے ہیں۔ مزید یہ کہ کوئی شخص اگر قرآن کو پڑھ کر

اسلام قبول کرتا ہے تو اس کے لیے بھی وہ "ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" کا مصداق ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اسلام قبول کرکے وہ جس سماج میں داخل ہوتا ہے وہ اس قسم کے نغموں سے گونج رہا ہے:

میرے مولا بلا لے مدینے میں

ماہنامہ برہان (نومبر ۱۹۸۸) میں ایک واقعہ پڑھا۔ مطبوعہ الفاظ کے مطابق وہ یہ تھا: "امریکہ میں مقیم تحریک اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ ڈاکٹر عرفان احمد صاحب نے ۲-۵ جولائی ۱۹۸۸ کو علی گڑھ میں انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن IFSO کے تحت منعقدہ ٹریننگ کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی ایک بات نقل کی۔ ایک بار دوران گفتگو مولانا نے امریکہ کی آزادی اور سیکولرزم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سوویت سیکولرزم اور ہندستانی سیکولرزم کے مقابلہ میں امریکی سیکولرزم کم خطرناک ہے۔ اس پر میں نے مولانا کی سادہ لوحی پر تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ مولانا، امریکہ میں بسنے والے مسلمان عالمی دشمنِ اسلام نمبر ایک امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں، اور وہ اس مسئلہ میں اتنے حساس ہیں کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ دنیا کا سب سے بڑا دشمن کون ہے تو چھوٹتے ہی وہ امریکہ کا نام لیتے ہیں" (صفحہ ۳۱-۳۲)

یہ نہایت عجیب بات ہے کہ امریکہ میں بسنے والے مسلمان شدید حساسیت کی حد تک یہ رائے رکھتے ہیں کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ اس کے باوجود ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے ملکوں کو چھوڑ کر اطمینان کے ساتھ امریکہ میں رہ رہے ہیں تاکہ اس سب سے بڑے دشمنِ اسلام کی مشین کا ایک پرزہ بن سکیں۔ حتی کہ پہلا موقع ملتے ہی وہ امریکہ کی شہریت حاصل کر لیتے ہیں تاکہ اپنی آنے والی نسلوں تک کو اس عظیم دشمنِ اسلام کی خدمت گزاری کے لیے وقف کر سکیں۔ واضح ہو کہ امریکی شہریت کسی کو صرف اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ امریکی نظام سے مکمل وفاداری کا فارم بھرے۔

تاہم اس سے قطع نظر، ذاتی طور پر مجھے دونوں میں سے کسی رائے سے بھی اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک یہ بات بالکل اضافی ہے کہ کون دشمن نمبر ۱ ہے اور کون دشمن نمبر ۲۔ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ ظاہری ناموافق حالات کے باوجود امکانی طور پر مواقع کار کہاں پائے جاتے ہیں۔ موانع کو

دیکھنا اور مواقع کو نہ دیکھنا ہی بے بصیرتی ہے، اور موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمان اسی بے بصیرتی میں مبتلا ہیں، ان کے اصاغر بھی اور ان کے تمام اکابر بھی۔

محمود السائس ایک مصری انجینیر ہیں۔ انھوں نے مصر کے بعد امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آج کل وہ امریکہ کے ایک بڑے انجینیرنگ ادارہ (Database Systems Services) میں منیجر ہیں۔ یہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی کا ادارہ ہے جو ہوائی جہاز بنانے کا کام کرتی ہے۔

محمود السائس کا کہنا ہے کہ میں (اور اسی طرح دوسرے بہت سے لوگ) جو یہاں ہیں، وہ شناخت کے بحران (Identity crisis) میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے امریکی شہریت حاصل کرنے کے لیے ۲۲ فروری ۱۹۷۸ کو ایک مخصوص فارم بھرا۔ اس کے تحت انھوں نے اس بات کا حلف لیا کہ میں ہر بیرونی وفاداری کو مکمل طور پر ترک کر کے پوری طرح صرف امریکہ کا وفادار رہوں گا۔ مگر دس سال گزرنے کے بعد بھی میں دہرا جذبات کا شکار ہوں" انھوں نے کہا۔

ایک طرف، محمود السائس کے الفاظ میں، ان کے معاہداتی فرائض (Contractual obligations) ہیں جن کا تعلق امریکہ سے ہے۔ دوسری طرف ان کے جذباتی احساسات (Sentimental feelings) ہیں جو ان کے سابق وطن مصر سے وابستہ ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے جذباتی انداز میں کہا کہ ان دونوں چیزوں کے درمیان میں اپنی شخصیت کو متعین نہیں کر پاتا۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ میری اصل قومیت کیا ہے:

Can you tell me what my true nationality is?

میرا اندازہ ہے کہ یہی ان تمام لوگوں کا حال ہے جنھوں نے یہاں کی شہریت حاصل کر لی ہے۔ ہر ایک دہرا شخصیت کا انسان بنا ہوا ہے۔ کچھ لوگ کش مکش میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ چھوڑ کر دوبارہ اپنے سابق وطن چلے گیے۔ اور کچھ لوگوں نے اس جھنجھٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس حد تک امریکی بنا لیا کہ اب وہ غیر ذبیحہ کھاتے ہیں۔ اور "عید" کے بجائے "کرسمس" کو اپنے تیوہار کے طور پر مناتے ہیں۔

مسلمان اگر مغربی ملکوں میں داعی بن کر آتے تو وہ وہی تاریخی کارنامہ انجام دیتے جو صحابہ کرام نے عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں جا کر انجام دیا۔ مگر وہ داعی بن کر نہیں آئے نتیجہ یہ

ہوا کہ وہ صرف دوسری قوموں کے مدعو بن کر رہ گیے۔

امریکی مسلمانوں کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ میں چار ملین کی تعداد میں وہ مسلمان ہیں جو حال میں ہجرت کرکے یہاں آئے ہیں۔ اور چار ملین سے کچھ زیادہ وہ لوگ ہیں جن کو پہلے بلیک مسلم کہا جاتا تھا، مگر اب وہ بقیہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں اور صرف مسلم کہے جاتے ہیں۔ یہ مسلمان چار ہزار سے زیادہ مسجدوں اور کلچرل مراکز میں اپنے مذہبی اعمال ادا کرتے ہیں :

In the U.S. it is estimated that there are 4 million Muslims of recent immigrants, and more than that of what was referred to, and is no more, of the black Muslims, because now the black Muslims have joined ranks with the rest and are all called Muslims. These Muslims practice their religion in over 400 smaller or larger mosques or cultural centres.

امریکہ کے کالے باشندوں (نیگرو) کو پہلے غلام سمجھا جاتا تھا۔ تاہم اب انھیں قانونی طور پر یکساں شہری حقوق حاصل ہیں۔ اگرچہ اپنی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر وہ اس قانونی امکان سے ابھی پورا فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

امریکہ کے بعض نئے مفکرین نے سفید فام باشندوں اور سیاہ فام باشندوں کے درمیان یکساں حقوق کی وکالت کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ کے سیاہ فام باشندے مختلف مگر یکساں (Different but equal) ہیں۔ یہ نہایت صحیح تعبیر ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ عورت اور مرد کے فرق کا بھی ہے۔ عورت مرد سے مختلف ہے، مگر حقوق اور انسانی احترام میں وہ یکساں ہے۔ لیکن امریکی مفکرین نے جس حقیقت کو سیاہ فام اور سفید فام باشندوں کے معاملہ میں سمجھ لیا ہے، وہ اس حقیقت کو ابھی تک عورت اور مرد کے معاملہ میں سمجھ نہ سکے۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ سفید فام اور سیاہ فام کے مسئلہ پر انھوں نے کھلے ذہن کے تحت سوچا، اس لیے وہ اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھ گیے۔ مگر عورت اور مرد کے معاملہ میں سوچتے ہوئے ان کی خواہش رکاوٹ بن گئی۔ اس نفسیاتی پیچیدگی کی بنا پر وہ اس دوسرے معاملہ میں اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔

امریکہ کے سیاہ فام باشندوں کو نیگرو کہا جاتا تھا۔ ان کی حیثیت وہاں بالکل غلام کی سی تھی۔ اس کے رد عمل میں ان کے درمیان مختلف تحریکیں اٹھیں۔ ایک تحریک کے قائد الیجا محمد تھے۔ انھوں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنا مذہب اسلام بتایا۔ ان کے پیرو بلیک مسلم کہے جاتے تھے۔

۱۹۷۵ میں الیجا محمد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کے لڑکے وارث دین محمد ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ وارث محمد نے جلد ہی پورے نظام کو بدل دیا۔ انھوں نے اپنے فرقہ کے لیے "بلیک مسلم" کے بجائے "امریکن مسلم" کی اصطلاح استعمال کی۔ انھوں نے اس سے انکار کیا کہ ان کے والد پیغمبر تھے۔ انھوں نے خالص اسلام (Pure Islam) کو اختیار کرنے کا اعلان کیا، یعنی وہی اسلام جو دوسرے تمام مسلمانوں کا ہے۔ انھوں نے امریکی حکومت سے وہ رقابت بھی ختم کردی جو ان کے والد غیر ضروری طور پر قائم کیے ہوئے تھے۔ فرقہ کے کچھ افراد نے ان کی مخالفت کی، مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ ۱۹۶۰ میں ان لوگوں کی تعداد ۱۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مگر ۱۹۸۵ میں اس فرقہ کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہوچکی تھی۔ اب ان کی تعداد چار ملین ہے۔ اس فرقہ کے بارہ میں امریکہ میں بہت سی معلوماتی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Charles E. Lincoln, *The Black Muslims in America*, 1982

الیجا محمد نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا۔ تاہم ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ امریکہ میں پیدا ہوئے۔ اگر وہ ہندستان یا پاکستان جیسے ملک میں پیدا ہوتے تو ان کا مستقبل بالکل دوسرا ہوتا۔ اب تک وہ اور ان کے متبعین کافر قرار دے کر امت مسلمہ سے الگ کردیے گیے ہوتے۔ مگر آج الیجا محمد کے جانشین وارث محمد اپنے چار ملین پیروؤں کے ساتھ امت مسلمہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید (پروفیسر جارج میسن یونیورسٹی، ورجینیا) نے بتایا کہ ۱۹۷۲ میں وہ وینزویلا کے شہر کارکس (Caracas) گیے۔ وہ ہوائی اڈہ پر اترے تو وہاں آدمیوں کا بہت بڑا ہجوم اکٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں ہوائی اڈہ پر کیوں جمع ہیں۔ مجمع میں سے ایک شخص نے کہا کہ آپ نہیں جانتے۔ آج محمد علی آنے والے ہیں۔ یہ سارے لوگ ان کے استقبال کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر

میاں محمد سعید نے کہا کہ محمد علی بلیک مسلم ہونے کی حیثیت سے الیجا محمد کا پیرو تھا۔ مگر ساری دنیا میں اس کا استقبال ایک مسلم ہیرو کی حیثیت سے کیا گیا :

He was welcomed all over the world as a Muslim hero

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی کلے اپنے آپ کو مسلم ملت کا ایک فرد سمجھنے لگے۔ امریکہ کے کالے مسلمان عمومی طور پر مسلمانوں کے قریب آگیے۔ یہ قربت بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ کالے مسلمانوں کے موجودہ لیڈر وارث محمد نے حج کے لیے جانا چاہا تو ان کو بھی بلا روک ٹوک حج کی اجازت مل گئی۔ وہاں ان کی ملاقات تمام دنیا کے مسلمانوں سے ہوئی۔ اس سے ان کو اپنے خیالات کی تصحیح میں مدد ملی۔

نیو آرک (Newark) میں رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں وارث محمد کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ جب وہ وہاں پہونچے تو ان کا خصوصی استقبال کیا گیا۔ یہاں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کھلے طور پر اعلان کیا کہ ان کے باپ الیجا محمد عام انسان تھے، وہ پیغمبر نہیں تھے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت آخری طور پر ختم ہو چکی ہے۔ ہم دوسرے مسلمانوں کے عقیدہ کو مانتے ہوئے ان کے ساتھ یکساں طور پر شامل ہوتے ہیں۔ ان کے والد کا کہنا تھا کہ موجودہ زمانہ میں صرف ان کی جماعت کو امت اسلام کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اپنی جماعت کا نام انھوں نے (Lost-Found Nation of Islam) رکھا تھا۔ وارث محمد نے اس کو بدل کر اپنی جماعت کا نام "امریکن مسلم" رکھ دیا۔ وغیرہ

قادیانی لیڈروں اور قادیانی فرقہ کا معاملہ بھی عین یہی تھا۔ مگر یہاں ان کے ساتھ بالکل مختلف سلوک کیا گیا۔ صحیح طریقہ یہ تھا کہ ان کے معاملہ میں دعوت اور نصیحت کے اصول پر اصلاحی عمل کا آغاز کیا جاتا۔ مگر مسلم علماء نے یہاں نفرت اور مناظرہ بازی اور تکفیر اور بائیکاٹ سے اپنے عمل کا آغاز کیا۔ وہ پہلے ہی مرحلہ میں ان کے دشمن بن کر کھڑے ہو گیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قادیانیوں میں مزید شدت بڑھتی گئی، وہ قریب ہونے کے بجائے اور زیادہ دور ہو گیے۔

مسلمانوں نے محمد علی کلے کو اپنا ہیرو بنایا۔ مگر انھوں نے ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنا ہیرو نہیں بنایا۔ حالانکہ محمد علی نے جو کارنامہ باکسنگ کے میدان میں انجام دیا تھا، وہی کارنامہ ڈاکٹر عبدالسلام نے سائنس کے میدان میں انجام دیا تھا۔ اگر مسلمان دونوں کے ساتھ یکساں اخلاقی سلوک کرتے تو

عین ممکن تھا کہ جس طرح "امریکی قادیانی" تائب ہو کر امت مسلمہ کا جزو بن گیا، اسی طرح "پاکستانی قادیانی" بھی اپنی اعتقادی اصلاح کر کے امت مسلمہ میں شامل ہو جاتا۔

واشنگٹن سے ایک عربی اخبار نکلتا ہے جس کا نام "الامۃ" ہے۔ اس کے چند شمارے دیکھنے کو ملے۔ یہاں کے انگریزی اخباروں کے مقابلہ میں اس کا معیار صحافت بہت کم تھا۔ اس کے شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ میں صفحہ اول پر خلیل جبران کے چند اقوال درج تھے۔ ایک قول یہ تھا:

وَيْلٌ لِأُمَّةٍ مُقَسَّمَةٍ إِلَى أَجْزَاءٍ وَكُلُّ جُزْءٍ يَحْسَبُ نَفْسَهُ فِيهَا أُمَّةً — اس قوم کے لیے خرابی ہے جو بہت سے حصوں میں بٹ جائے اور ہر جزء یہ سمجھے کہ وہی قوم ہے۔

مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں ہندستان اور پاکستان کے لوگ آباد ہیں۔ یہ لوگ مختلف اسلامی شخصیتوں سے متاثر ہیں اور اس کے مطابق اپنے اجتماعات کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مختلف ناموں سے الگ الگ تنظیمیں بھی قائم کر رکھی ہیں۔

اسی قسم کی ایک تنظیم کا اجتماع امریکہ میں جولائی ۱۹۸۸ میں ہوا۔ اس کی روداد میں نے پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہماری تنظیم نے مختلف مقامات پر "دعوتی اجتماعات" کیے۔ اسی کے ساتھ درج تھا کہ "افغانستان، فلسطین اور ہندستانی مسلمانوں کے حق میں مختلف شہروں میں مظاہرے اور جہاد کانفرنسیں منعقد کی گئیں"۔ میں اس اندازِ کار کو عملاً بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ قومی احتجاج اور دعوت حق کا کام، دونوں ساتھ ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

رپورٹ کے مطابق، تنظیم کے جولائی ۱۹۸۸ کے اجتماع میں اس کے صدر نے جو تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارا نصب العین اسلامی نظام حکومت کا قیام ہے۔ اسی میں دنیا کے تمام مسائل کا حل ہے۔ انھوں نے گرجدار آواز میں کہا کہ مسلم نوجوان خالد و طارق کو اپنا آئیڈیل بنائیں اور انسان کو انسان کی غلامی سے نکالنے کے لیے مجاہد بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کی جذباتی تقریر کے دوران بار بار اللہ اکبر کے نعرے لگتے رہے۔

اس اجتماع میں مشہور انگریز نومسلم یوسف اسلام، سابق کیٹ اسٹونس (Cat Stevens) کو بھی بلایا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق، یوسف اسلام کی تقریر کے دوران آڈیٹوریم پر مکمل سناٹا چھایا رہا۔ سامعین مبہوت ہو کر ان گفتگو سنتے رہے۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا۔ "روشنی کی طرف سفر"

انھوں نے اپنے قبول اسلام کا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ دولت، شہرت، عزت سب کچھ میرے پاس موجود تھی، مگر دل کا سکون نہ تھا۔ ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ شراب اور منشیات کے ذریعہ سکون حاصل کرو۔ اسی دوران مجھے قرآن کا انگریزی ترجمہ مل گیا۔ اس کو پڑھ کر میرے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ سکون کا اصل ماخذ کیا ہے، قرآن نے میرے دل کے آخری گوشہ تک اپنی جگہ بنالی۔

ہندستان اور پاکستان کے "اسلام پسند" جو اپنے ملکوں کو چھوڑ کر امریکہ گیے ہیں۔ وہ وہاں بھی سیاست اور جہاد کی تقریریں کرتے رہتے ہیں، مگر اس قسم کی تقریروں میں وہاں کے باشندوں کے لیے کوئی کشش نہیں۔ البتہ یوسف اسلام جیسے لوگوں کی آواز میں ان کے لیے بے پناہ کشش ہے۔ مغرب کے سامنے سیاسی انداز میں اسلام کو پیش کرنا مغرب کو اسلام سے دور کرنا ہے۔ البتہ اگر مغرب کے سامنے فطرت کے انداز میں اسلام کو پیش کیا جائے تو وہاں کا انسان اس کے اندر اپنے لیے بے پناہ کشش پائے گا۔

امریکہ میں اب خدا کے فضل سے بہت سے لوگ پیدا ہو گیے ہیں جو الرسالہ کو خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابراہیم مامون صاحب نیویارک میں مقیم ہیں۔ وہ عرصہ سے الرسالہ کے قاری ہیں۔ اب انھوں نے پانچ کی تعداد سے الرسالہ کی ایجنسی شروع کردی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ امریکی پروفیسر ٹامس (Prof. Thomas) ان کے ملاقاتیوں میں تھے، ان کو انھوں نے الرسالہ انگریزی دیا اور مرکز کی چھپی ہوئی انگریزی کتابیں پڑھائیں۔ پروفیسر ٹامس کو یہ کتابیں بہت پسند آئیں۔ اب وہ اسلام سے مانوس نظر آرہے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کے مختلف مقامات پر لوگ الرسالہ (اردو یا انگریزی) منگاتے ہیں۔ وہ ان کو خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔

ہلٹن ہوٹل کے ایک بہت بڑے ہال کے باہر ایک خوبصورت بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا: بازار۔ اس کے اندر مختلف "اسلامی" چیزوں کی دکانیں تھیں۔ اس کے زیادہ بڑے حصہ میں کتابوں کے اسٹال تھے۔ دو بڑی میزوں پر اسلامی مرکز (دہلی) کا بھی اسٹال تھا جس پر تمام کتابیں اور الرسالہ (اردو، انگریزی) رکھے گئے تھے۔ بڑی تعداد میں

لوگوں نے اسے آکر دیکھا اور کتابیں حاصل کیں۔ کئی لوگوں نے پورے پورے سٹ حاصل کیے۔

صغیر احمد اسلم صاحب یہاں کے ایک بڑے تاجر ہیں۔ ان کو تذکیر القرآن بہت زیادہ پسند آئی۔ انھوں نے بار بار اصرار کیا کہ پوری تفسیر کو آڈیو کیسٹ پر لے آئیے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں امریکہ میں لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت نہیں، البتہ سننے کا وقت انھیں مل جاتا ہے۔ اور یہ وقت وہ ہے جب کہ وہ کار پر سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں کے آدمی کے پاس اگر کوئی "خالی وقت" ہے تو وہی ہے جب کہ وہ کار سے سفر کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہ وقت روزانہ اس کو کافی مقدار میں ملتا ہے۔ اگر تذکیر القرآن کو کیسٹ پر منتقل کر دیا جائے تو ہر آدمی اس کو اپنی کار میں رکھے گا اور سفر کے وقت روزانہ اس کو سنتا رہے گا۔

۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو واپسی ہوئی۔ پین ایم کی فلائٹ نمبر ۱۲۰ کے ذریعہ لاس اینجلیس سے روانہ ہوا۔ دن کے بارہ بجے جہاز کے اندر داخل ہوا تو بڑے جہاز کی بیشتر سیٹیں خالی تھیں۔ یہ غالباً اس حادثہ کا اثر تھا جو ۲۱ دسمبر کو پین ایم کے جہاز کے ساتھ پیش آیا۔ انسان زندگی کے بعد پیش آنے والی موت سے ڈرتا ہے۔ مگر موت کے بعد پیش آنے والی موت سے کسی کو اندیشہ نہیں۔

اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا لندن کی طرف جا رہا ہے۔ سطح زمین پر بادل چھائے ہوئے تھے، مگر ۳۳ ہزار فٹ اوپر پہونچ کر ماحول بدل چکا تھا۔ اب جہاز نیلے رنگ کے کھلے آسمان میں اڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ زندگی کے تمام جھگڑے نچلی سطح پر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کو اٹھا کر بلندی پر لے جا سکیں تو تمام جھگڑے اور فساد اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۶۶ کے ذریعہ سفر ہوا۔ یہ یکم جنوری ۱۹۸۹ کی تاریخ تھی۔ جہاز میں بیشتر ہندستانی مسافر تھے۔ چنانچہ اناؤنسر کی زبان بدل گئی۔ اس سے پہلے انگلش اور جرمن میں اعلانات کیے جا رہے تھے۔ اب جہاز کے اناؤنسر نے انگلش کے ساتھ ہندی میں اعلان شروع کر دیا:

ہمیں آشا ہے کہ ہمارے ساتھ آپ کی یاترا سکھت رہے گی۔ یدی آپ کسی قسم کی سہائتا چاہیں تو ہم آپ کی سیوا میں اُپستھت ہیں۔ ہم اپنے سب یاتریوں کو

نئے سال کی شبھ کامنائیں دیتے ہیں۔

ایک تاجر کو معلوم ہے کہ اسے اپنے گاہک سے وہی زبان بولنا ہے جو گاہک کی اپنی زبان ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے داعی اس راز کو نہیں جانتے کہ وہ اپنے مدعو سے خود مدعو کی زبان میں کلام کریں۔ اگر کوئی شخص بظاہر مدعو کی زبان میں بولنے والا ہو تو وہ بھی صرف حروف تہجی کے اعتبار سے ہوگا۔ اسلوب کلام اور انداز بیان کے اعتبار سے دیکھئے تو مدعو کے آشنا اسلوب اور اس کے مانوس انداز میں بولنے والے داعی سرے سے دنیا میں موجود ہی نہیں۔

فرینکفرٹ سے دہلی کا سفر مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ یعنی سورج کے الٹی طرف۔ چنانچہ دن بہت تیزی سے ختم ہوا۔ فرینکفرٹ سے روانگی ہوئی تو دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ آٹھ گھنٹہ کا سفر طے کر کے جب دہلی پہونچے تو یہاں رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ یعنی "آٹھ گھنٹہ" میں "تیرہ گھنٹہ" کا سفر طے ہوا۔

۲ جنوری ۱۹۸۹ کو رات کے ڈیڑھ بجے جہاز دہلی پہونچا۔ آٹھ گھنٹہ کی لمبی اڑان کے بعد جب جہاز حفاظت کے ساتھ زمین پر اترا تو مسافروں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ہم جس زمین پر اترے وہ خود بھی ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے خلا میں دوڑ رہی ہے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم ایک جہاز سے اتر کر دوسرے جہاز پر سوار ہوئے۔ ہم انسانی سواری سے نکل کر خدائی سواری میں بیٹھ گئے۔

انسانی سفر مسلسل جاری ہے۔ انسانی سفر کی منزل موت ہے نہ کہ کوئی ایرپورٹ۔ یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو (کن فی الدنیا کانك عابر سبیل)

۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو ہندستان سے امریکہ کے لیے روانگی ہوئی تھی۔ یکم جنوری اور ۲ جنوری ۱۹۸۹ کی درمیانی رات کو دوبارہ میں نے ہندستان کی زمین پر قدم رکھا۔ یہ سفر اگرچہ بہت محدود مدت کے لیے تھا، مگر اس مدت میں پورا کیلنڈر تبدیل ہو گیا۔ تاریخ کے صفحہ پر ۱۹۸۸ کے بجائے ۱۹۸۹ لکھا جا چکا تھا۔ میں "حال" سے نکل کر "مستقبل" میں داخل ہو گیا۔

دہلی سے کیلی فورنیا کے سفر میں میں نے کرۂ ارض کے آدھے سے زیادہ حصہ کا سفر کیا۔

جانے اور آنے کو ملاکر مجموعی طور پر تقریباً ۳۰ ہزار میل کا فاصلہ طے ہوا۔ دس دن کے بعد جب میں اس لمبے سفر سے واپس ہوکر اپنے ٹھکانے پر پہونچا تو میں نے سوچا کہ دنیا کے سفر میں آدمی بہر حال ایک روز اپنے ٹھکانے پر واپس آجاتا ہے۔ مگر ایک اور سفر ہے جس کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔

یہ موت کا سفر ہے جو ہر ایک کو لازمی طور پر کرنا ہے۔ موت کے سفر کے بعد نہ واپسی کا کوئی امکان ہے اور نہ تلافی مافات کی کوئی صورت۔ ہر آدمی کو لازماً ایک ایسی سواری پر بیٹھنا ہے جو کبھی اس کو واپس لے کر نہیں آئے گی کہ وہ اپنی کوتاہی اور اپنی سرکشی کی تلافی کر سکے۔ آہ، کیسا سخت معاملہ انسان کے ساتھ پیش آنے والا ہے اور وہ کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔ دنیا کی تمام عجیب باتوں میں سب سے زیادہ عجیب بات بلاشبہ یہی ہے۔

کشمیر میں پروگرام

انجمن مظہر الحق بیروہ، کشمیر کے زیر اہتمام ایک دینی اجتماع ۲۰ اگست ۱۹۸۹ کو ہوگا۔ انشاء اللہ دہلی سے مولانا وحید الدین خاں صاحب اس میں شرکت کریں گے۔ پہلا پروگرام بعد نماز ظہر ۲ بجے اقبال پارک سرینگر میں ہوگا۔ اس موقع پر خطاب کا عنوان یہ ہوگا:

اسلام — نئے عہد کے دروازہ پر

اسی روز چار بجے شام لالہ رُخ ہوٹل سرینگر میں قارئین الرسالہ اور الرسالہ کی دعوت و تحریک سے متفق افراد کے ساتھ مولانا موصوف کی ایک مجلس مشاورت ہوگی۔ اس سلسلہ میں مزید تفصیل مقامی اخبارات میں شائع کرائی جائے گی۔ نیز حسب ذیل پتہ پر رابطہ قائم فرمائیں:

سید عبد اللطیف ایم اے، سرپرست انجمن مظہر الحق، بیروہ، 193411 کشمیر

تیوہار اور قومی یک جہتی

تیوہار کو عربی میں عید، ہندی میں تیوہار اور انگریزی میں فیسٹول (Festival) کہتے ہیں۔ تیوہار کا بنیادی مقصد اجتماعی روایات کو زندہ رکھنا اور فرد کو فرد سے جوڑنا ہے۔ انسانی تہذیب کی پوری تاریخ میں تیوہار کا رواج رہا ہے۔ سال کی خاص تاریخوں میں مشترک طور پر قومی تقریب منعقد کرنا، یا مشترک تصور کے تحت کسی یادگار دن کو اجتماعی خوشی منانا، اسی کا نام تیوہار ہے۔

تیوہار عام طور پر سال کی مقرر تاریخوں میں ہوتے ہیں۔ اس روز سب لوگ جمع ہو کر مخصوص انداز میں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اس طرح تیوہار لوگوں کے اندر اجتماعیت اور یک جہتی پیدا کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ وہ سماج کے ایک حصہ کو اس کے دوسرے حصہ سے قریب لے آتا ہے۔ تیوہار ملاقات اور تعلق کی مضبوط اور پائدار زمین فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

تیوہار کا ایک حصہ عام طور پر کسی مخصوص سماجی گروہ کے اپنے عقیدہ اور اپنی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایک حصہ عمومی ہوتا ہے جو صرف ایک سماجی گروہ کی دلچسپی کی چیز نہیں ہوتا بلکہ پورے سماج، اور وسیع تر معنوں میں تمام انسانوں سے تعلق رکھتا ہے۔

مثلاً عید میں دوگانہ نماز کا تعلق مسلم عقیدہ سے ہے۔ وہ مسلمانوں کے مذہب کا حصہ ہے۔ مگر عید میں شیر بنی کھانا اور کھلانا ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ وہ انسانی سطح پر میل جول کو بڑھانے والا ہے۔ وہ ایک عالمی چیز ہے نہ کہ کوئی گروہی چیز۔ اسی طرح دیوالی میں لکشمی کی پوجا کرنا ہندو عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہندو مذہب کا جزء ہے لیکن گھر کی صفائی ایک ایسی چیز ہے جس میں ہر آدمی کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ اس کو ہر آدمی خوشی سے اختیار کر سکتا ہے۔

میں آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے والے ہندستان میں پیدا ہوا۔ مجھے اپنے بچپن کی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ جب دیوالی کا تیوہار آتا تو مسلمان ہندوؤں کے یہاں تحفے بھیجتے۔ ہم لوگ بھی اپنے

گھروں کی صفائی اسی طرح کیا کرتے تھے جس طرح ہندو لوگ اس تیوہار میں اپنے گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔ اسی طرح جب عید کا تیوہار آتا تو ہندو بچے بھی مسلم بچوں کی طرح نئے کپڑے پہنتے۔ ہندو گھروں میں شیرینی کا اہتمام کیا جاتا اور وہ اپنے مسلم پڑوسیوں کی تواضع کرکے خوش ہوتے۔

اس طرح مسلمانوں نے ہندو تیوہاروں میں اپنے لئے دلچسپی کا سامان پایا تھا اور ہندو، مسلمانوں کے تیوہاروں میں اپنی دلچسپی کا سامان پا رہے تھے۔ دونوں فرقوں کے تیوہار ایک اعتبار سے ان کے اپنے فرقے کے تیوہار ہوتے تھے اور دوسرے اعتبار سے ان کی حیثیت مشترک تیوہار کی ہوتی تھی۔ اس دوسرے اعتبار سے دونوں گویا ایک دوسرے کے تیوہاروں کو مل جل کر مناتے تھے۔ اس طرح دونوں فرقوں میں رواداری کو فروغ ملتا تھا۔ دونوں بار بار ایک دوسرے سے قریب ہوتے رہتے تھے۔

اس چیز نے اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کامل ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کر رکھی تھی۔ دونوں میں کسی قسم کی اجنبیت حائل نہ تھی۔ دونوں اپنے آپ کو مسلم اور ہندو سمجھتے ہوئے وسیع تر ہندستانی قوم کا جزء بنے ہوئے تھے۔ دونوں اس عظیم ملک سے یکساں محبت کرتے تھے جس کا نام اب تاریخ میں برصغیر ہند (Indian sub-continent) لکھا جاتا ہے۔

یہی وہ دور ہے جس کی بابت سرسید نے اپنی ایک تقریر (۲۷ جنوری ۱۸۸۳) میں کہا تھا:

"ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے، جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں۔ ہندستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا اور جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں، جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ درحقیقت ہندستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔ اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی اور بہبودی ممکن ہے۔ اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت اور ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔"

پھر یہی وہ ہندستان ہے جس کا ترانہ اقبال نے اپنے اشعار میں گایا تھا۔ ان کا یہ شعر اس مشترک جذبہ کی بہترین عکاسی کرتا ہے جس کو ہندستان کے تقریباً ہر شخص نے سنا ہے اور بے شمار

لوگوں نے اس کو گایا ہے :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اس طرح کے مشترک ماحول اور یک جہتی کی فضا پیدا کرنے میں تیوہار نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نفرت اور باہمی دوری کے قاتل ہیں۔ اگر تیوہاروں کو صحیح جذبہ کے ساتھ اور مشترک انداز میں منایا جائے تو ہمارے سماج سے ہر قسم کے جھگڑے اور فساد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔

مجھے مدھیہ پردیش کے ایک صاحب نے بتایا۔ وہاں کے ایک قصبہ میں فرقہ وارانہ تناؤ کا ماحول تھا۔ ہولی کے تیوہار کا زمانہ آیا تو سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اس موقع پر فرقہ وارانہ فساد ہو کر رہے گا۔ ہولی کا رنگ انسانی خون کے رنگ میں تبدیل ہو جائے گا۔

اس وقت ایک بزرگ ہندو، مسلمانوں کے علاقہ میں گئے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ میں آپ لوگوں کا خیر خواہ ہوں اور آپ لوگوں کو ایک مشورہ دینے آیا ہوں جس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ اگر آپ میرے اس مشورہ کو قبول کر لیں تو امید ہے کہ ہماری بستی بہت بڑی آفت سے بچ جائے گی۔

انھوں نے کہا کہ اس وقت ہماری بستی کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ مجھے بظاہر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات باقی رہے تو ہولی کے موقع پر ضرور فرقہ وارانہ فساد ہو جائے گا اور ہماری سڑکوں پر رنگ کے بجائے خون بہے گا۔ اس مسئلہ کے حل کی ایک نہایت آسان تدبیر ہے اور اس وقت میں آپ کو وہی تدبیر بتانے آیا ہوں۔

انھوں نے کہا کہ ہولی کے دن جب ہندو لڑکے ہولی کھیلتے ہوئے مسلمانوں کے محلہ کے پاس پہنچیں تو مسلمان اس سے الگ نہ رہیں۔ بلکہ مسلمان لڑکے بھی باہر نکل کر ان کی پارٹی میں شامل ہو جائیں اور ان کے ساتھ ہولی کھیلنا شروع کر دیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر بالفرض آپ لوگوں کے کپڑوں میں ہولی کا رنگ لگنے کا کچھ عذاب ہو تو میں بھگوان سے کہتا ہوں کہ وہ اس کو میرے حصہ میں ڈال دے اور اس تدبیر سے فساد کے ٹلنے کا جو ثواب ہے وہ سب آپ لوگوں کے حصہ میں لکھ دیا جائے۔ یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آگئی، چنانچہ انھوں نے ہولی کے موقع پر ایسا ہی کیا۔

ہولی کے دن حسب معمول ہندو نوجوانوں کی پارٹی مسلم محلہ سے گزرنے والی سڑک پر آئی۔ اس وقت، پہلے سے طے کئے ہوئے منصوبہ کے مطابق، کچھ تفریح پسند مسلم نوجوان اپنے گھروں سے نکلے اور جوش وخروش کے ساتھ ہندو پارٹی میں مل گئے۔ وہ اس وقت انھیں جیسے بن کر ان کے ساتھ ہولی کھیلنے لگے۔

ایسا کرنے کے بعد اچانک ساری فضا بدل گئی۔ جو دن دو دشمنوں کے ٹکراؤ کا دن بنتا وہ دو دوستوں کے ملاپ کا دن بن گیا۔ ہولی کا رنگ جو خون کے چھڑکاؤ کی صورت اختیار کرنے والا تھا، وہ پیار و محبت میں بدل کر لوگوں کے اوپر گلاب جل کا چھڑکاؤ بن گیا۔

اسی طرح مہاراشٹر کے ایک شہر کا قصہ ہے۔ وہاں ہر سال ایک خاص تاریخ کو گن پتی کا جلوس نکلتا ہے جو گویا ان کا ایک سالانہ تیوہار ہے۔ ہندو اس میں بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ کئی سال ایسا ہوا کہ جلوس جب مسلم محلہ سے گزرنے والی سڑک پر پہنچا تو کسی نہ کسی بات پر دونوں فرقوں میں اشتعال پیدا ہو گیا اور فساد کی نوبت آگئی۔

پچھلے سال وہاں کے مسلمانوں نے مشورہ سے یہ طے کیا کہ وہ جلوس کے خلاف روک ٹوک نہیں کریں گے اور نہ اس کی روٹ بدلنے پر اصرار کریں گے۔ چنانچہ جب جلوس آیا تو انھوں نے پچھلے سالوں کے برعکس جلوس کا استقبال اور اس کو راحت پہنچانے کی کوششیں کیں۔ مثلاً یہ گرمی کا موسم تھا۔ چنانچہ انھوں نے راستہ میں جگہ جگہ ٹھنڈے پانی کا انتظام کر دیا۔ وغیرہ

اس کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا۔ دو فرقے جو اس سے پہلے ایک دوسرے کو حریف کی نظر سے دیکھتے تھے، وہ ایک دوسرے کو دوست کی نظر سے دیکھنے لگے۔ جلوس کا قافلہ جو عام حالت میں دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرنے کا سبب بنتا، وہ دونوں کے درمیان دوستی اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

تیوہار کو اگر صحیح طریقہ سے منایا جائے تو بلاشبہ وہ رواداری اور اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہ پورے سماج کو مشترک انسانی رشتہ میں جوڑ کر صالح معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اور صالح معاشرہ سے پیدا ہونے والے نتیجہ ہی کا دوسرا نام یک جہتی ہے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ اپریل ۱۹۸۹ کو نشر کی گئی۔

۱۔ الرسالہ کے مضامین خدا کے فضل سے ہر حلقہ اور ہر جماعت کے پرچوں میں نقل کیے جارہے ہیں۔ اس طرح وہ ہر حلقہ میں پھیل رہے ہیں اور عام مسلمانوں کے دل کی آواز بنتے جارہے ہیں۔ مثال کے طور پر جمعیۃ علماء ہند کے موقر ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی نے حسب ذیل مضامین مکمل طور پر اور نمایاں طور پر شائع کیے ہیں:

الجمعیۃ	۹ فروری ۱۹۸۹ میں	تحریک بابری مسجد
الجمعیۃ	یکم جون ۱۹۸۹ میں	حقیقت بے نقاب
الجمعیۃ	۸ جون ۱۹۸۹ میں	تصویر کے دو رُخ

ہم الجمعیۃ کا اور دوسرے ان پرچوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو تعمیری افکار کی بیش از بیش اشاعت میں ہمارا تعاون کر رہے ہیں۔

۲۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۹ کو نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ میں ایک خصوصی تقریب ہوئی۔ سفارت خانہ کے افسران کے علاوہ شہر کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر سفیر پاکستان مسٹر نیاز اے نائک نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ صدر اسلامی مرکز کی کتاب پیغمبر انقلاب (انگریزی) کو پاکستان میں ہونے والے انٹرنیشنل سیرت مقابلہ میں اول انعام کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ مقابلہ عالمی سطح پر کیا گیا تھا اور انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اسپینی، ترکی، فارسی وغیرہ زبانوں کی کئی سو کتابیں ججوں کے سامنے پیش کی گئی تھیں۔ ان میں سے جج صاحبان نے پیغمبر انقلاب (انگریزی) کو اول درجہ کی کتاب قرار دیا۔ اس تقریب کی رپورٹ انگریزی، ہندی، اردو اخبارات میں ۱۳ مئی کو شائع ہوئی۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہفت روزہ نئی دنیا، ۲۶ مئی ۱۹۸۹

۳۔ اسلامی مرکز اور الرسالہ کے مشن کے بارہ میں عالمی سطح پر جاننے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ ۲۵ مئی ۱۹۸۹ کو مرکز میں آسٹریلیا کی ایک ٹی وی ٹیم آئی۔ وہ صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لینا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت صدر اسلامی مرکز ایک سفر میں تھے، اس لیے انٹرویو نہ لیا جاسکا۔ تاہم وہ مرکز کا انگریزی لٹریچر اپنے ساتھ لے گئے۔

۴۔ الرسالہ کے مضامین اپنی عمومی پسندیدگی کی بنا پر نہ صرف اردو اخبارات اور رسائل میں نقل ہوکر وسیع پیمانہ پر پھیل رہے ہیں بلکہ دوسری زبانوں کے پرچوں میں بھی ترجمہ ہوکر شائع کیے جارہے ہیں۔ مثلاً گوالیار کے ہندی روزنامہ دیش بندھو (۷ مئی ۱۹۸۹) نے الرسالہ کا ایک مضمون شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "رمضان" یہ ہندی ترجمہ محمد انوار الحق صدیقی ایم اے نے کیا تھا۔

۵۔ غازی آباد سے ایک ہندی ہفتہ وار نکلتا ہے جس کا نام ھنڈن پتھ ہے۔ اس نے "صدائے حق" کے نام سے ایک مستقل کالم شروع کیا ہے۔ اس کے تحت ہر ہفتہ الرسالہ کا کوئی مضمون ہندی میں ترجمہ کرکے شائع کیا جاتا ہے۔ ہندی ترجمہ کا کام مسٹر ایس ایس بھٹناگر انجام دے رہے ہیں۔

۶۔ مولانا امیر اللہ خاں (محبوب نگر) لکھتے ہیں: آپ کی نئی کتاب "دین کامل" کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں سحر رکھا ہے۔ جو آپ کی تحریر پڑھتا ہے مسحور ہوجاتا ہے۔ "دین کامل" دین کی کامل ترین ترجمانی ہے جو عصری اسلوب میں کی گئی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کی بقار و ترقی اور دین اسلام کی اشاعت کا اہم ترین تقاضا دعوتی شعور اور عمل دعوت ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد اور اچھوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

۷۔ الرسالہ کا تعمیری مشن خدا کے فضل سے دن بدن لوگوں کے ذہنوں پر چھاتا جارہا ہے۔ بہت سے لوگوں نے اپنی بولیاں بدل دی ہیں۔ وہ لوگ جو اس سے پہلے شکایت اور احتجاج کو کام سمجھ رہے تھے اب وہ اپنے آپ کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس کا اظہار مختلف صورتوں میں سامنے آرہا ہے۔ مثلاً ایک مشہور مسلم رہنما نے اپنی ایک تقریر میں کہا: "میں ببانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ہم لوگ جو شکایت کرتے ہیں وہ شکایت بجا ہے۔ ہم شکایت کرتے رہیں گے۔ شکایت کرنا ہمارا حق ہے۔ ہم کو یہ حق ہے کہ اپنے قومی جلسوں میں اپنی مجلسوں میں اور اخباروں کے کالموں میں اس بات کی شکایت کریں کہ ہمارا فلاں حق نہیں مل رہا ہے۔ ہمارے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے۔ ہم اپنی حکومت سے شکایت

کرتے رہیں گے اور سوبار کریں گے۔ ہمیں اپنی آواز بلند کرنے کا حق ہے۔ ہم ہمیشہ انتظامیہ اور حکمراں جماعت سے شکایت کریں گے۔" (۲۵ مئی ۱۹۸۹) مقرر کے یہ الفاظ واضح طور پر دفاعی نفسیات کے تحت نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شکایتی سیاست میں اپنا یقین کھو دیا ہے اور اب لفظوں کے سہارے دوبارہ اس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

۸۔ کچھ نئی انگریزی، ہندی اور اردو کتابیں اس وقت پریس میں ہیں۔ اردو میں دو نئی کتابیں چھپ رہی ہیں (۱) اسلام دور جدید کا خالق۔ (۲) اقوالِ حکمت۔

۹۔ ایک کشمیری نوجوان لکھتے ہیں: اللہ کا شکر و احسان ہے کہ اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہوں۔ میرے شبہات ختم ہو گیے ہیں اور یہ سب آپ کی اعلیٰ تحریروں کا کرشمہ ہے۔ مسلم نوجوانوں کو کسی عالم کا کوئی لٹریچر بدل نہیں سکتا سوا تذکیر القرآن کے۔ یقیناً اس وقت سب سے اہم کام مسلم نوجوانوں کو تذکیر القرآن کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب کرنا ہے۔ بے شک تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے جس میں قرآن کا اصلی مقصد (ہدایت و نصیحت) سامنے لایا گیا ہے۔ اب میں الرسالہ کی ایجنسی لے رہا ہوں۔ الرسالہ کے مضامین بہت معنی خیز اور بہترین ہوتے ہیں۔ الرسالہ کے سفرنامے سے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ (انجینئر الطاف حسین، ہٹن)

۱۰۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: آپ لوگوں کو سنجیدگی اور حوصلہ مندی کی طرف بلاتے ہیں۔ میں نے آپ کی کتابیں پڑھیں۔ آپ دور حاضر میں منفرد شخصیت رکھتے ہیں جو حقائق کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ دنیا میں بے شمار قائدین ہیں جو کہتے ہیں کہ آنکھ بند کرو اور چٹان سے ٹکرا جاؤ اور پھر دیکھو کامیابی تمہارے قدم چومتی ہے۔ چنانچہ ہم چٹان سے ٹکرا جاتے ہیں اور پھر کبھی سر نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن آپ کا انداز انتہائی معنی خیز اور دلوں میں اترنے والا ہوتا ہے۔ اس سے متاثر ہو کر میں نے طے کیا ہے کہ میں الرسالہ کی ایجنسی قائم کروں اور دس پرچہ ہر ماہ منگا کر پھیلاؤں (سید فرید الحسن ہاشمی، حیدرآباد)

۱۱۔ ایک نئی کتاب زیر طبع ہے۔ اس کا نام ہوگا: رُشدیات: شتم رسول کا مسئلہ۔ اس کتاب میں زیر بحث موضوع پر سنت رسول کی روشنی میں تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سے شائع کیا

AL-RISALA

Annual Subscription Rates:

	One year	Two year
INLAND	Rs. 48	Rs. 90
ABROAD (By air mail)	US $ 25	US $ 50
(By surface mail)	US $ 10	US $ 20

SUBSCRIPTION FORM

Please send me AL-RISALA

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years

Name .....

Address .....

.....

GIFT SUBSCRIPTION

Please send AL-RISALA to my friend/relative to the following address:

☐ Urdu ☐ English for ☐ 1 year ☐ 2 years I am enclosing cheque Postal Order/Bank Draft/M.O. Receipt No. .....

Name .....

Address .....

.....

Please send this together with the payment to the Circulation Manager
AL-RISALA C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

Delhi Postal Regd. No. D(SE) 243 RN 28822/76 August 1989 No 153

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	125/-
〃 〃 جلد دوم	125/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیّبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳